تاریخ اور ادب کا باہمی ربط

ڈاکٹر صادق نقوی

ایم اے۔ ایم فل۔ پی ایچ ڈی

چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز۔ شعبہ تاریخ

عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد۔

Andhra Pradesh, Hyderabad

باب العلم سوسائٹی

۲۲-۸-۳۶۱/۱۶

دارالشفاء، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۲۴

فون:- ۵۲۹۳۲۳

قیمت:- ۱۲۰ روپیے

بیرونی ممالک میں:- ۱۰ ڈالر

تاریخ اور ادب کا باہمی ربط

ڈاکٹر صادق نقوی

ایم اے ۔ ایم فل ۔ پی ایچ ڈی

چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز ۔ شعبہ تاریخ

عثمانیہ یونیورسٹی ۔ حیدرآباد۔

Andhra Pradesh, Hyderabad

باب العلم سوسائٹی

۲۲-۸-۳۶۱/۰۱۶

دارالشفاء ۔ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۲۴

فون :۔ ۵۲۹۳۲۳

قیمت :۔ ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک میں :۔ ۱۰ ڈالر

ناشر : باب العلم سوسائٹی۔ حیدر آباد

سنہ اشاعت : نومبر ۱۹۹۶ء

تعداد : پانچ سو

ٹائپ سٹنگ : انعم کمپیوٹر ہو یوان دیوڈھی حیدر آباد۔

مصنف کا پتہ : ۱۶/۳۶۱-۸-۲۲، دارالشفاء۔ حیدر آباد۔ ۲۴

یہ کتاب اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین

سلسلہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
۱	میرے تاثرات ۔ پروفیسر سیدہ جعفر	۱
۲	ڈاکٹر صادق نقوی ایک مورخ، شاعر اور ادیب ○ ڈاکٹر مسعود جعفری	۴
۳	میں اور میری یہ کتاب کچھ حقائق کچھ لفظوں میں ○ ڈاکٹر صادق نقوی	۸
۴	تاریخ اور ادب کا باہمی ربط	۱۱
۵	فیض کی شاعری کا تاریخی پس منظر	۲۷
۶	دور آصفجاہ ششم میر محبوب علی خاں بہادر پر لنٹن کی کتاب کا تنقیدی جائزہ	۴۴
۷	نصرتی کی مثنوی علی نامہ کی تاریخی اہمیت	۵۳
۸	شاہان قطب شاہیہ اور غیر مسلم رعایا	۵۸
۹	دور قطب شاہی کے دو بزرگ پیشوان سلطنت	۶۴
۱۰	مرائت صادق کا تنقیدی جائزہ	۷۲
۱۱	نواب عنایت جنگ بہادر کے مورخین پر احسانات	۷۶
۱۲	علامہ نجم آفندی کی رثائی شاعری	۸۰
۱۳	علامہ نجم آفندی کی شاعری میں انسانی اقدار کا تصور	۹۱
۱۴	میر کاروان دکھن۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۹۸
۱۵	حضرت باقر امانت خانی کی مرثیہ نگاری	۱۰۴
۱۶	خیرات ندیم ۔ اپنی شاعری کے آئینہ میں	۱۱۳

اپنے چچا

محترم سید رضا حسین نقوی

کے نام

جن کی محبت، شفقت اور

ہمت افزائی نے مجھے ادب کے راستہ پر چلنے

کا سلیقہ عطا کیا۔

میرے تاثرات

پروفیسر سیدہ جعفر
(سابق صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی و سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد)

ڈاکٹر صادق نقوی کو حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں اس لئے بھی مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہے کہ وہ ایک خوش گو شاعر ہی نہیں، ایک شعلہ بیان مقرر اور ایک اچھے ادیب بھی ہیں ۔ تاحال ڈاکٹر صادق نقوی کے تین مجموعہ کلام شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں اور ارباب ذوق و اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں "تاریخ اور ادب کا باہمی ربط" صادق نقوی کے چودہ مضامین کا مجموعہ ہے ۔ اس سے ان کی نثر نگاری کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ان مضامین میں علمیت کا جوہر بھی ہے اور ادبیت کا عنصر بھی ۔ صادق نقوی نے ان مضامین میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جن پر مبصرین نے کم لکھا ہے ۔ اس مجموعے کا پہلا مضمون " تاریخ اور ادب کا باہمی رشتہ " ہے اس میں مصنف نے علم تاریخ کی مائیت پر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ۔ اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ داں کے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حال کو ماضی سے کس طرح مربوط کرے بدلتے ہوئے معیار اور تغیر پذیر قدروں کے وسیلے سے تاریخ کا مطالعہ آساں نہیں ہوتا چنانچہ صادق نقوی رقمطراز ہیں : ۔

" بدلتے ہوئے معیار اور فکر کے ہر دم بدلتے ہوئے راستوں پر منجمد ماخذوں کو سہارا بنانا بہت سی دشواریوں کو تاریخ دان کے روبرو لاتا ہے "

اس مضمون میں تاریخ سے متعلق ایک اہم نکتہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ تاریخ کی کتاب کو پڑھنے سے پہلے تاریخ دان کے ذہن کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ اس کے انداز نظر کا ادارک حاصل ہو ۔ مضمون کا ماحاصل مصنف کے الفاظ میں یہ ہے کہ " کسی واقعے کا صاف صاف اظہار تاریخ کے دائرے

میں ہوتا ہے لیکن اس واقعے سے ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات کا اظہار علا تم
شاعری میں ہوتا ہے" حقیقیت یہ ہے کہ ادب اور تاریخ ایک دوسرے سے مربوط ہو
عرب کی ابتدائی تاریخ مرتب کرنے میں قدیم عربی شعراء کا کلام ممد و معاون ثابت
عہد کے رسم و رواج، معتقدات اور طرزِ فکر کا اُس دور کے ادب سے بخوبی اندازہ ہ
ہے۔ فیض کی شاعری کے پس منظر کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صادق نقوی نے ان تم
اور تہذیبی محرکات کا جائزہ لیا ہے جنھوں نے فیض کی شاعری کو ایک خاص سانچے میں ڈ
انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ترقی پسند تحریک امپریلزم (Imperialism
خلاف تھی۔ آریہ، عرب، ترک، افغان، مغل، پرتگیزی، فرانسیسی اور انگریز سب غیر
انھوں نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ صادق ن
فیض کو ایک ایسا دانشور بتایا ہے جو "حساس فکر" اور "گہری نظر" کا حامل تھا۔ "دور آ
ششم میر محبوب علی خان بہادر کا تنقیدی جائزہ" میں صادق نقوی نے ایچ آر لنٹن
Lynton اور موہنی رتن کی تصنیف دی ڈیز اف دی بی لوڈ Days of the
Beloved پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اس کتاب میں بیان کئے ہوئے واقعات کے
مشکوک قرار دیا ہے اور لکھتے ہیں "مجھے اس کتاب کو اس دور کی صحیح اور مکمل تاریخ
میں پس و پیش ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ کتاب کا بڑا حصہ کچھ گنے چنے افراد کی یادد
بھروسہ کر کے لکھا گیا ہے" اس کتاب کا دوسرا ماخذ انڈیا آفس کا وہ ریکارڈ ہے جو رزیڈ
دفتری مراسلوں پر مشتمل ہے اور یہ انگریزوں کے نقطہ نظر کا ترجمان ہے۔

نصرتی کی مثنوی علی نامہ کی تاریخی اہمیت" میں ڈاکٹر صادق نقوی نے اُس د
تاریخی واقعات کے تناظر میں نصرتی کے "علی نامہ" کا جائزہ لیا ہے۔ قلعہ پنہالہ کی فتح، ملتا
جوہر کی بغاوت، شائستہ خان کی شکست، سورت پر شیواجی کا حملہ، جے سنگھ اور علی عادل
معاہدہ خواص خان کی شیواجی پر فتح، شیواجی اور جے سنگھ کی لڑائی، جے سنگھ کا بیجاپور پر
عادل شاہی اور مغل افواج کی جنگ کے متعلق نصرتی نے "علی نامہ" میں جو معلومات

ہیں انھیں تاریخ کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے "شاہان قطب شاہیہ اور غیر مسلم رعایا" میں قطب شاہی بادشاہوں کی رعایاپروری وسعت نظر اور غیر مسلم رعایا کو ان کی طرف سے دی جانے والی مراعات کی تفصیل قلمبند کی ہے ۔ اس مجموعہ مضامین میں "مراۃ صادق کا تنقیدی جائزہ" نواب عنایت جنگ بہادر کے مورخین پر احسانات" "علامہ نجم آفندی کی شاعری میں انسانی اقدار، علامہ نجم آفندی کی رثائی شاعری" "میر کارواں دکن ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور" حضرت باقر امانت خانی کی مرثیہ نگاری" اور خیرات ندیم اپنی شاعری کے آئینے میں" جیسے مضامین بھی شامل ہیں ان مضامین میں ڈاکٹر صادق نقوی کی تنقیدی صلاحیتیں بروے کار آئی ہیں ۔ صادق نقوی نے تاریخ نویسی کے بارے میں بڑے فکر انگیز اور بصیرت افروز نکات بیان کئے ہیں مثلاً یہ کہ تاریخ نویسی میں پہلے مفروضہ قائم کرکے اس کو ثابت کرنے تاریخی واقعات تلاش نہیں کرنا چاہیئے ۔ یہ صحیح طریقہ تحقیق نہیں ہے اس کے برخلاف تاریخی حقائق کے پیش نظر مفروضات پیش کئے جائیں تاکہ غیر جانبداری کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کیا جاسکے ۔ میں "تاریخ اور ادب کے باہمی ربط" کی اشاعت پر ڈاکٹر صادق نقوی کو مبارکباد دیتی ہوں علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ تصنیف ایک گرانقدر تحفہ ہے۔

ڈاکٹر صادق نقوی ایک مورخ، شاعر اور ادیب

ڈاکٹر مسعود جعفری
ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی،۔۔۔شعبہ تاریخ، گورنمنٹ کالج عادل آباد

ڈاکٹر صادق نقوی کی سرگزشت ایک عہد، ایک دور اور ایک مکتب فکر کی سرگزشت ہے۔ پچھلے بیس پچیس برسوں سے وہ حیدرآباد کی ادبی، مذہبی، تہذیبی و علمی محفلوں کے رو رواں رہے ہیں وضع داری، محبت، شرافت، اخلاص و انکساری کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ وسیع المشربی، علم و فن اور دانشوری کی عظیم روایات کا حسین و جمیل مرقع ہیں۔ دن رات علمی سرگرمیوں میں غرق، غم حیات و غم دوران کے اضطراب سے لاپرواہ، ہر لمحہ تحقیق و جستجو کے جادہ پر گامزن، تاریخ و فلسفہ کی گتھیوں کو سلجھانے میں محو رہنے والی شخصیت کا نام ہے صادق نقوی بارش ہو یا، آندھی، کڑاکے کی سردیاں ہوں یا، بدن کو جھلسادینے والی کڑی دھوپ کتب خانوں کی چھان بین، مخطوطات کی تلاش، نادر مضامین کی صورت گری میں مصروف رہتے ہیں، دل کا عارضہ، اطباء کا آرام کرنے کا مشورہ لیکن شہروں شہروں، ملکوں ملکوں سمیناروں، کانفرنسوں، جلسوں، مشاعروں میں شرکت کرنے سے باز نہیں آتے۔ صادق نقوی نہ صرف ایک دلنواز شاعر، سحر انگیز ادیب، جادو بیان مقرر، جید مورخ ہیں بلکہ انسانی اقدار کے عظیم پاسدار بھی ہیں۔ خدا نے صادق نقوی کو بے شمار نعمتوں سے سرفراز کیا ہے بلاشبہ وہ ایک صد رنگ Multi Dimentional شخصیت کے حامل ادیب ہیں اب تک انہوں نے سینکڑوں مضامین، بے شمار تقریریں سپرد زبان و قلم کی ہیں۔ نام، عزت، شہرت، آسودگی سب کچھ پالی ہے۔ لیکن غرور و تمکنت کا شکار نہ ہو سکے۔ امیر ہو یا غریب، ادنی ہو یا اشرف، عالم ہو یا امی سب سے خندہ پیشانی سے ملنا اور ان کے سینوں کو علم و آگہی سے معمور کرنا انکی زندگی کا روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔

صادق نقوی کی تازہ تصنیف "تاریخ اور ادب کا باہمی ربط" اردو میں اپنی نوعیت کی

یک انوکھی کاوش ہے ۔ تاریخی واقعات کی گہری پرچھائیاں ہمیں ادب، موسیقی، مصوری،
سنگ تراشی وغیرہ میں صاف دکھائی دیتی ہیں ۔ کوئی ادیب و شاعر اپنے عہد کے سیاسی، مذہبی،
سماجی و تہذیبی حالات سے گریز کرتے ہوئے خیالی جنت میں پناہ نہیں لے سکتا ۔ واقعات اس
کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں ۔ احساسات پر تازیانے برساتے ہیں ۔ اسکی تخلیقات میں عہد کی
روح بولنے لگتی ہے ۔

ڈاکٹر صادق نقوی نے بڑی ہی عرق ریزی سے ادب اور تاریخ کے باہمی رشتہ کو عیاں
کرنے کی کامیاب سعی کی ہے ۔ زیر نظر کتاب فکر انگیز مضامین سے بھری پڑی ہے جیسے تاریخ اور
ادب کا باہمی رشتہ ۔ تاریخ یقیناً ایک عہد آفرین مضمون ہے ۔ اسکی اہمیت و افادیت سے کوئی
ذی ہوش انکار نہیں کر سکتا ۔ لیکن تاریخ میں معروضیت (Objectivity) کا خیال رکھنا
بے حد ضروری ہوتا ہے ۔ اگر مورخ معروضیت کے بجائے اپنے شخصی معتقدات کے زیر اثر
حالات و واقعات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرے تو ایسی صورت میں سچائیاں اور
صداقتیں مجروح ہو جاتی ہیں ۔ ایسا ہی کچھ مغربی مورخین نے ہندوستان کی تاریخ کے تعلق سے
رویہ اپنایا تھا ۔ جس کا شکار جانے انجانے میں ہمارے معاصرین قومی مورخین بھی ہو گئے ۔
ممتاز مورخ ای ۔ ایچ کار نے کہا ہے کہ "مورخ کو افراد کے تعلق سے اخلاقی فیصلے صادر کرنے
کے بجائے واقعات، اداروں، اور ماضی کے منصوبوں کے متعلق رائے دینی چاہیئے ۔ مشہور
مورخ گبن نے عیسائیت کے قیام، اور اسلام کے عروج کو انقلابات سے تعبیر کیا ۔ اس نے
بے نظیر واقعات کا عمومی انداز میں جائزہ لیا ۔ جدید مورخین بھی انگریزی، فرانسیسی، روسی اور
دیگر انقلابوں کے بارے میں وہی رویہ اختیار کرتے ہیں ۔ مورخ بے نظیر میں دلچسپی نہیں لیتا
بلکہ بے نظیر واقعہ میں کیا چیز عمومی ہے ۔ اس میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے ۔ ایک مورخ کے
مذہب کا پتہ اس کے اپنائے ہوئے مفروضہ سے چلتا ہے ۔ حقائق، ثبوت و شواہد کو جمع کرنا،
اسکی ترجمانی کرنا ایک مشکل عمل ہے ۔ اشوک، کنشک اور ہرش وغیرہ نے سرکاری سطح پر
بدھ مت کو پھیلایا ۔ اشوک نے سفیروں کو تبت اور سیلون کو پرچار کرنے کے لئے روانہ کیا ۔

چٹانوں اور ستونوں پر اصول کندہ کروائے۔ بدھ مت کی شاہی سرپرستی کی۔ لیکن کسی مورخ نے بھی اشوک پر مذہبی جانب داری کا الزام عائد نہیں کیا۔ سرکاری اخراجات کا ناجائز صرفہ کرنے کا سوال نہیں اٹھایا بلکہ خراج تحسین پیش کیا۔ لیکن اگر کوئی مسلم بادشاہ مذہب کی سرکاری اشاعت کرتا ہے تو اس پر جانب داری کا لیبل عائد کیا جاتا ہے ایسا کیوں؟ یہ دورخی احساس کیوں۔ کیونکہ مورخین کے ہاں یکساں پیمانے نہیں ہیں۔ لہذا، ضرورت ہے کہ ذاتی، خاندانی، نسلی، قومی، علاقائی تعصبات سے اونچا اٹھ کر مورخ کو نتائج اخذ کرنا چاہیے۔ تب ہی ماضی کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے آئیگی اور حال کی بہت سی الجھنیں ختم ہوجائینگی ایک مورخ کو عمومیت سے کام لینا چاہیئے۔ اور عمومیت تاریخ کے لئے اجنبی شئے نہیں ہے۔ ڈاکٹر صادق نقوی نے بھی عمومیت سے کام لیا ہے۔ اور تاریخ نویسی کی اعلیٰ ترین روایات کے تقدس کو برقرار رکھا ہے۔

تاریخ کی ترتیب میں بنیادی ماخذوں کے بجائے دوسرے درجہ کے ماخذ جیسے کتابیں، اخبارات و رسائل وغیرہ کو زیادہ اہمیت دی جائے تو ظاہر ہے تاریخ کے چہرے پر خراشیں نمودار ہوجائیگی اور ایک فرمانروا، ایک انتظامیہ کی غلط تصویر سامنے ہوجائیگی۔ ڈاکٹر صادق نقوی نے ان سوالات پر بحث کرتے ہوئے بنیادی ماخذوں کی اہمیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ مبالغہ آرائی اور انتہا پسندی سے احتراز کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ قطب شاہی عہد دکن کی تاریخ کا زرین عہد ہے۔ مذہبی رواداری قطب شاہوں کا طرہ امتیاز رہی۔ فارسی کے ساتھ تلگو کی بھی سرپرستی کی گئی۔ مسجدوں، خانقاہوں کے ساتھ مندروں کو بھی سرکاری امداد دی گئی۔ آخری قطب شاہی حکمراں ابوالحسن کے زمانے میں مادنناواکنا کو سلطنت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز کیا گیا۔ پیشوائے سلطنت اور وزیر مال جیسے قلمدانوں سے سرفراز کیا گیا۔ یہاں قطب شاہوں کی سماجی و سیاسی مساوات کی پالیسی نقطہ عروج پر پہونچ جاتی ہے۔

نظام ہشتم محبوب علی پاشاہ کے عہد کا صادق نقوی نے خوبصورت احاطہ کیا ہے۔ درباری امراء بالخصوص سالار جنگ اول، مہاراجہ نریندر پرشاد، مہاراجہ کشن پرشاد بہادر،

فخرالملک وغیرہ کی فراخ دلی، سخاوت، اور انسان دوستی ضرب المثل تھی۔ دربار حیدرآباد میں رقابتیں مروت، تہذیب و شائستگی کے دلکش نقاب میں ہوا کرتی تھیں لیکن دلی سلطنت یا بہمنی سلطنت کے دربار کی طرح وحشت و بربریت کا شکار نہ ہونے پائیں۔ دلی سلطنت کے عظیم سلطان غیاث الدین بلبن نے چالیس طاقتور امیروں کا بے رحمی کیساتھ صفایا کر دیا اور عظیم وزیر سلطنت محمود گاواں کا بہیمانہ قتل درباری سازشوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن قطب شاہی یا آصف جاہی درباروں میں ایسے مذموم واقعات رونما نہیں ہوئے۔ پیشوائے سلطنت میر مومن، ابن خاتون، سالار جنگ اول اور امرائے عظام امیر کبیر نواب رشید الدین خان وغیرہ نے سلطنت کے وقار، بادشاہ کے جاہ و جلال کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ حیدرآباد کی انسان دوستی کی عظیم روایات کو برقرار رکھا۔ انگریزی ثقافت و کلچر کو حدود میں رکھا۔ دربار اور سلطنت کے مغلیہ کردار کو بہر طور باقی رکھنے کی شعوری کوشش کی۔ 1857ء کے پرآشوب دور میں بھی سالار جنگ اول نے برطانوی سلطنت کی مدد کی۔ خوشگوار تعلقات برقرار رکھے، سالار جنگ برار کا حصول چاہتے تھے۔ انکی نگاہیں مستقبل پر تھیں۔ سیاسی بصیرت اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے حیدرآباد کو آفات و آلام سے محفوظ رکھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے تدبر اور حکمت عملی سے حیدرآباد کے سیاسی مفادات کا تحفظ کیا۔ بادشاہ کی عظمت اور وقار کو برقرار رکھا۔ اس خصوص میں ڈاکٹر صادق نقوی نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں حالات کا جائزہ لیا ہے

اس کتاب کے سارے مضامین فکر انگیز اور علم و آگہی سے معمور ہیں ان کے پڑھنے سے ذہن میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اور فہم و ادراک کو جلا ملتی ہے اور تاریخ اور ادب کے باہمی رشتہ کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ڈاکٹر صادق نقوی کی یہ معرکتہ الاراء تصنیف دنیائے اردو کا ایک گراں مایہ گنجینہ ہے۔ تاریخ اور ادبی حلقوں میں اسکی پذیرائی ہوگی۔ میں ڈاکٹر صادق نقوی کو ایک شاندار کتاب کی رونمائی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

میں اور میری یہ کتاب کچھ حقائق کچھ لفظوں

ڈاکٹر صادق نقوی

قلم سے میرا رشتہ ۱۹۵۵ء میں قائم ہوا جب میری پہلی غزل نظام کالج کے
شائع ہوئی۔ لیکن شاید یہ رشتہ میری کاوشوں سے زیادہ میری میراث تھا۔ میرے
جناب سید احمد حسین نقوی مرحوم یوں تو بنیادی طور پر کھیل کے میدان سے وابستہ
ساتھ ساتھ انھوں نے قرطاس و قلم کو بھی فراموش نہیں کیا۔ شاعری والد محترم
لیکن والدہ محترمہ سکینہ بیگم عفت مرحومہ نے مذہبی شاعری کو اپنی نجات کا ذریعہ
والدہ مرحومہ کے نوحوں کا مجموعہ "ثبوت نجات" نام سے شائع ہوچکا ہے۔ میرے گ
علمی ماحول میں میری ذہنی تربیت میں میرے دونوں چچاؤں کا بڑا حصہ ہے۔ ہندو
مشہور ادیب و صحافی سید بادشاہ حسین نقوی مرحوم کی ادبی مصروفیات اور ان کے
کے طویل سلسلے نے مجھے ادب کی طرف راغب کیا۔ میرے چھوٹے چچا سید رضا حسین
شفقت اور ہمت افزائی نے مجھے وہ حوصلہ عطا کیا جس کے سہارے میں اپنے ادبی سفر
رکھ سکا۔

یہ میری پانچویں نثری کتاب ہے پہلی چار کتابیں میں نے دکن کی تاریخ کے
موضوعات پر لکھیں جو شائع ہو کر تاریخ کے اسکالرس میں میری امیدوں سے زیادہ
ہوئیں پہلی کتاب itical study of Ali Nama as Historical
Document کے بعد دوسری کتاب Shahi Ashur Khanas of
Hyderabad City کے دو ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں اور دو کتابوں Muslim
ious Institution and their role under the Qutub
Shahs اور The Iran - Deccan Relations کے دوسرے ایڈیشن

عنقریب شائع ہو جائیں گے۔ ان انگریزی کتابوں کے علاوہ پچھلے ۱۸ سال سے انگریزی میں ایک ریسرچ جرنل "The Noor" کے نام سے ایڈٹ کر رہا ہوں۔ جرنل اب دنیا کے مختلف ممالک خاص طور پر مغربی ممالک میں کافی مقبول ہو چکا ہے ملک کے نامور محققین اور علماء کے مقالے اس جرنل میں شائع ہوتے ہیں۔ نثر میں نے بڑے عرصہ تک انگریزی میں لکھی کچھ مجبوری کی بناء پر کچھ اس لئے کے تاریخ کے اسکالرس کی بڑی تعداد اردو سے نابلد ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں نے اردو سے اپنا مضبوط رشتہ کبھی بھی توڑا ہو۔ میرے اب تک تین شعری مجموعے "روشن لکیریں" "جذبہ صادق" اور روشن زاویے" شائع ہو چکے ہیں میرے شعری مجموعوں کو نہ صرف اہل فکر و فن نے سند پسندیدگی عطا کی بلکہ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش اور اردو اکیڈمی یو۔پی نے انعام سے نوازا۔ نشر و اشاعت کے اس تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے میں تقریباً پچھلے تیس برسوں سے مشاعروں، سیمناروں، سمپوزیمس اور جلسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتا رہا ہوں۔ میری اردو نثر کی یہ پہلی کتاب "تاریخ اور ادب کا باہمی ربط" ان مقالوں پر مشتمل ہے جنھیں میں نے ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہونے والے سیمناروں میں پیش کیا تھا۔ ان میں سے دو ایک مقالے سیمناروں کے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کی بڑی تعداد شائع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ان میں سے کچھ مقالوں پر نظر ثانی بھی کی ہے اور ان میں کہیں کہیں اضافہ و کمی بھی کی ہے تاکہ مقالہ تاریخ اور اردو کے جدید انکشافات اور ریسرچ کے مطابق ہو جائے۔ خاص طور سے اس کتاب کے پہلے مقالے کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ میں نے یہ مقالہ تاریخ اور ادب کے عام قاری کو نظر میں رکھکر لکھا ہے اس لئے شاید تاریخ کے اسکالرس کو جن کی نظروں میں Historiography کا جدید لٹریچر ہے کچھ معمولی سا لگے۔ لیکن میرا معروضہ یہ ہے کہ اس مقالے کے عنوان سے انصاف کرنے میں میں نے جو طرز اختیار کیا ہے آپ اس کو اہمیت دیں۔ اقتباسات تو ظاہر ہیں میں نے اپنے نظریات کو دلیل مہیا کرنے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ اس پہلے مقالے کے علاوہ اس کتاب میں چھ اور مقالے ایسے تاریخی عنوانات پر لکھے گئے ہیں جن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

بھی دور کے مکمل واقعات کا احاطہ نہیں کرتی ۔ بلکہ یہ واقعات کے ہجوم سے مورخ کے منتخب کیے ہوئے واقعات سے عبارت ہوتی ہے (۵) E.H. Carr نے اسے بڑی اچھی مثال سے واضح کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ مورخ کی مثال اس مچھلی فروش جیسی ہوتی ہے جس کے آگے مچھلیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوتا ہے ۔ مچھلی فروش اس ڈھیر سے اپنی پسند کی مچھلیاں منتخب کرتا ہے ۔ انہیں گھر لے جاتا ہے اور جیسا چاہتا ہے ویسے انھیں پکا کر پیش کرتا ہے ۔(۶)

Polybius کا خیال بھی یہی ہے کہ تاریخ ان واقعات کا ریکارڈ ہے جو لکھے جانے کے قابل تھے یہ ایسے منفرد واقعات کی تفصیل ہے جنھیں جاننا اور یاد رکھا جانا سود مند ہوتا ہے ۔ Prof. Findlay کے خیال میں تاریخی واقعات اپنے تسلسل ہی میں پڑھے اور سمجھے جاسکتے ہیں ۔ لیکن Carlyle کا خیال ہے کہ تاریخ صرف اور صرف ان بڑے لوگوں کی سوانح ہے جن کے کارنامے بھی عظیم تھے (۷) ۔ لیکن Carlyle نے اپنی وضاحت میں شخصیت کے پس منظر کو نظرانداز کر دیا ہے ۔ اس کمی کو A.L. Rowse نے پورا کیا اس نے لکھا کہ تاریخ یقیناً صاحب اعزاز افراد کی سوانح ہے لیکن ان کی عظمت کا یقین سماج ، جغرافیائی اور طبعی حالات کے پس منظر میں کیا گیا ہے ۔

پروفیسر شیخ علی کے خیال میں مورخین کے درمیان اس سوال کا سب سے اچھا جواب Ernest Bernheim کا ہے وہ لکھتا ہے کہ تاریخ ایک سائنس ہے ۔ جو ۔ Psyco Physical پس منظر میں افراد کے شخصی اور مجموعی کارناموں کا تجزیہ سماج کے ایک جز کی صورت میں پیش کرتی ہے ۔(۹)

پروفیسر شیخ علی نے تاریخ کو ایک علحدہ پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ جو پچھلی نصف صدی سے مورخین کے درمیان زیادہ پسندیدہ ہو گیا ہے وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم تاریخ میں کیا کرتے ہیں ؟ ہم اس میں انسان کو ماضی کے واقعات بتا کر یہ سمجھاتے ہیں کہ وہ کیا ہے اور اس نے کیا کیا ہے دوسرے الفاظ میں انسان کو انسان کے سمجھنے میں مدد دینا تاریخ نویسی ہے ۔ ان کے خیال میں سائنس ، آرٹس فلسفہ اور دوسرے ایسے ہی کئی علوم جب ایک

تاکہ واقعات کی ترتیب اسے نتیجہ تک پہنچائے۔(۱)

تاریخ دراصل ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہی تحقیق تلاش اور تجسس کے ہیں (۲) یونان کے سب سے قدیم مورخ فلسفی Dionysins نے تاریخ کو ایک ایسا فلسفہ قرار دیا ہے جو قانون کے ذریعے وضع کیا جاتا ہے۔ لیکن ارسطو کا خیال اس سے کچھ مختلف ہے وہ لکھتا ہے کہ تاریخ مسلسل تحقیق کے ذریعہ ماضی کے حقائق کی تصیح سے عبارت ہے۔اس کے خیال میں چونکہ فطرت انسانی میں کوئی تبدیلی نہ واقع ہوئی ہے۔اور نہ واقع ہوگی۔اس لئے حقائق کا تسلسل مکمل بھی ہے اور مطابق بھی۔(۳) ارسطو کے شاید اسی قول کے زیر اثر یہ بات صدیوں سے مانی ہوئی حقیقت کی طرح تسلیم کی جاتی ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ History repeats itself اب قریب قریب ایک مقولہ بن گیا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اپنے کو کبھی نہیں دہراتی اور نہ تاریخ نے اپنے آپ کو کبھی دہرایا ہے۔ کبھی کہیں کسی مملکت، ریاست یا ملک میں ایسا ہوا بھی ہے تو یہ محض اتفاق ہے کلیہ نہیں۔ کسی بھی ملک کی تاریخ کو پڑھئے یا تاریخ عالم کے اہم واقعات کا تجزیہ کیجئے۔یہ بات آپ پر واضح ہوجائے گی کہ ایک ہی قسم کے واقعات کے اسباب مختلف تھے۔ مثلاً انقلاب فرانس کے وجوہات انقلاب روس کے وجوہات سے مختلف ہیں اسی طرح امریکہ کی جنگ آزادی اور ہندوستان کی کشمکش آزادی کے وجوہات میں زمین آسمان کا فرق ہے حالانکہ دونوں کا مقصد ایک تھا اسی طرح یوں بھی ہوتا ہے کہ اسباب ایک ہوتے ہیں لیکن نتیجہ مختلف نکلتا ہے۔ مثلاً انقلاب فرانس کے واقعات کا تسلسل Reign of terror اور اس کے بعد ڈکٹیٹر شپ تک پہنچا۔جو کسی اور انقلاب کے بعد اتنی شدت سے کسی اور ملک میں ظاہر نہیں ہوا۔اس مقولے کے پس منظر میں جو بات پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ قاری کے ذہن کو Wisdom عطا کرتا ہے۔Francis Bacon نے اسے واضح الفاظ میں یوں لکھا ہے کہ تاریخ وہ مضمون ہے جو قاری کے ذہن کو روشنی بھی دیتا ہے اور اسے فکر کی گہرائی بھی عطا کرتا ہے (۴)۔ Seloy نے تاریخ کو ماضی کی سیاست اور مستقبل کی تاریخ قرار دیا ہے۔ لیکن تاریخ کسی

دائرے میں سمٹ جاتے ہیں تو تاریخ بنتی ہے۔

لیکن اکثر یوں ہوتا ہے کہ مورخ کسی جنگ کے واقعات کے تانے بانے بننے میں اتنا منہمک ہوجاتا ہے کہ اس کا بنیادی مقصد اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ تاریخ سائنس ہے یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ سائنس کی طرح تاریخ کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے جس کے سمجھنے کے لئے ذہنی تربیت درکار ہے۔

سائنس کے برخلاف تاریخ کی یہ انفرادیت ہے کہ اس کے کردار جیتے جاگتے ہوتے ہیں اور سماج کا جز ہوتے ہیں۔ اس لئے سماج میں پیدا ہونے والے ہر ارتعاش کا ان کے ذہن پر ایک اثر مرتب ہوتا ہے اور ان کا عمل سماج کی پرسکون فضا میں ارتعاش لانے کا سبب بنتا ہے تاریخ فہمی کے سلسلہ کا مشکل مسئلہ یہ ہے کہ تاریخ داں جن واقعات کا تجزیہ کرتا ہے وہ اس سے بہت دور ماضی میں ہوتے ہیں۔ وقت کی رفتار سماجی اقدار روایات اور معیارات کو مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے کسی ماضی کے واقعہ کا تجزیہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تاریخ داں کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے دور سے ماضی کے دور کی طرف لوٹ جائے۔ جب تک اس کا ذہن اس دور سے مربوط نہ ہوگا جس دور کے واقعات کا تجزیہ کررہا ہے تجزیہ صحیح نہ ہوگا۔

تاریخ کے اہم ماخذ تاریخی عمارتیں مخطوطات، فرامین سکے اور کتبے ہیں۔ یہ سب کے سب ماخذ ایک طرح سے منجمد ہوتے ہیں۔ ان میں جو ہے وہ گویا پتھر کی لکیر ہے جسے بدلا نہیں جاسکتا۔ یہ ماخذ تو منجمد ہوتے ہیں لیکن معیارات تغیر سے عبارت ہوتے ہیں مورخ کے لئے جو چیز مسئلہ بن جاتی ہے وہ حال سے ماضی کو مربوط کرنا ہے۔ بدلتے ہوئے معیار اور فکر کے ہر دم بدلتے ہوئے سوالوں پر ان منجمد ماخذوں کو سہارا اپنانا بہت سی دشواریوں کو مورخ کے روبرو لاتا ہے۔

دنیا کے انقلابوں نے انسانی فکر پر سب سے گہرا اثر کیا ہے امریکہ کی جنگ آزادی، فرانس اور روس کے انقلاب اور اسی دور میں انگلستان میں انسانی حقوق کے حصول کی جدو جہد

نے دنیا کے بڑے حصے پر جو اثرات مرتب کیے ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ تخت و تاج یکے بعد دیگرے ورق کائنات سے غائب ہوتے گئے۔ خود مختار بادشاہوں کی حکومتوں کے خاتمہ نے تاریخ پر گہرا اثر ڈالا بلکہ یہ بھی صحیح ہے کہ تاریخ کا دھار ایک لخت بدل گیا۔ اب مورخین کی توجہ کا مرکز بادشاہ امراء اور سلطنتوں کی وسعت کے لئے لڑی جانے والی جنگیں نہیں ہیں بلکہ فکر کے موضوع سماجی اور معاشی زندگی کی طرف مڑ گئے ہیں۔ یہی صحت مند رجحان مورخ کے لئے کثیر مسائل کے لانے کا باعث بنا ہے۔ دنیا کی تاریخ اور خاص طور سے ہندوستان کی دور وسطیٰ اور ابتدائی دور جدید کی تاریخ کا سرسری مطالعہ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ان ادوار میں مورخین کی ساری توجہ تخت و تاج سے مربوط تھی۔ یوں سمجھئے کہ مورخ ایک شخص ہوا کرتا تھا جو دور سے کھڑا ایک ڈرامہ دیکھ رہا ہوتا۔ اس ڈرامے کا مرکزی کردار تخت پر بیٹھا ہوا خود مختار حکمراں ہوتا تھا۔ اسکے اہل خاندان اور امراء اس ڈرامے کے دوسرے اہم کردار ہوتے تھے۔ مورخ اس ڈرامے کو توجہ سے دیکھتا اور ہونے والے واقعات کو ایمانداری کیساتھ لکھتا جاتا۔ اسی انداز کی لکھی ہوئی کتابیں تاریخ کا ماخذ بنیں۔ لیکن یوں بھی ہے کہ تاریخ داں بہرحال ایک انسان ہوتا ہے جس کے اپنے مذہبی عقائد، سیاسی رجحان اور اقتصادی مسائل ہوتے ہیں۔ یہ بحث آج کل بڑے دلچسپ موڑ تک آگئی ہے کہ تاریخ دان اپنے سے جدا ہو کر اور ذہن پر مرتب ہونے والے اثرات کی نفی کر کے تاریخ لکھ سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن ماضی کے تاریخ کی ورق گردانی جس نظریہ پر صاد کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا ہے کہ مورخ اپنے وجود سے آزاد ہو کر تاریخ لکھ سکے۔ جب تاریخ ان ذہنی تحفظات کے ساتھ لکھی جائے گی تو ظاہر ہے کہ اسے پڑھ کر اس کی اساس پر نتیجہ اخذ کرنیوالا غلط راستوں پر نکل جائے گا مثلاً ضیاء الدین برنی نے محمد بن تغلق کے تعلق سے جو کچھ لکھا وہ اس انداز میں لکھا گیا کہ محمد بن تغلق مورخین کی ایک بڑی تعداد کے لئے wisefool of Indian History ہو گیا۔ لیکن جب خود برنی کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ اس کی تاریخ کا بڑا حصہ اس کے اپنے شدید جذبات نفرت کے زیر اثر مرتب ہوا ہے۔ اسی طرح ابو الفضل کی دونوں کتابوں

"اکبر نامہ" اور "آئین اکبری" کے مطالعہ سے اکبر کی جو شخصیت سامنے آتی ہے اس میں اکبر مافوق البشر لگتا ہے۔ اکبر کی یہ تصویر مورخ ابو الفضل کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ اس ابو الفضل کی کھینچی ہوئی ہے جو اکبر کا وفادار دوست، اس کی سلطنت کا وفادار عہدہ دار اور اکبر کے فلسفہ اور نظریات کا قائل تھا۔ تاریخ فہمی کے لئے یہ ضروری ہے کہ تاریخ کی کسی کتاب کو پڑھنے سے پہلے خود تاریخ داں کو پڑھ لیا جائے تاکہ واقعات سے جذبات کو اور حقیقتوں سے مبالغہ کو الگ کیا جاسکے۔

E.H.Carr نے اسے مثال کے ذریعہ بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے وہ لکھتا ہے فرض کیجیے کہ ایک کمرے میں چار مورخین بیٹھے ہیں ان میں سے ایک مورخ کے پاس سگریٹ ختم ہوجاتے ہیں وہ سگریٹ خریدنے کے لئے کمرہ سے باہر نکلتا ہے پیچھے سے ایک تیز رفتار موٹر کار آتی ہے اور اسے ٹکر دے دیتی ہے۔ مورخ زخموں کی تاب نہ لاکر اسی مقام پر دنیا سے گذر جاتا ہے کمرے میں بیٹھے تینوں مورخین اس واقعہ کو دیکھ رہے ہیں۔ واقعہ کو اب انھیں کاغذ پر محفوظ کرنا ہے۔ ان تینوں کے لئے واقعہ کی حقیقت ایک ہی ہے ایک مورخ کمرے سے نکلا اور کار کی زد میں آکر دنیا سے رخصت ہوگیا ظاہر ہے کوئی بھی مورخ نہ واقعہ کو بدلے گا نہ حقیقت کو تبدیل کرے گا لیکن وہ جب اس واقعہ کے اسباب و نتائج کو لکھے گا تو اس کے شخصی جذبات اس میں کار فرما ہونگے۔ پہلے مورخ کو سگریٹ نوشی سے سخت نفرت ہے وہ وجوہات کے ضمن میں لکھے گا کہ سگریٹ نوشی کی بلا نے اس شخص کی جان لے لی۔ دوسرے مورخ کو حکومت سے بیر ہے اس لئے موت کی وجہہ اس کے پاس یہ ہے کہ سڑک پر روشنی کا انتظام اتنا ناقص تھا کے کار کے ڈرائیور کو سڑک عبور کرنے والا نظر نہیں آیا۔ تیسرے مورخ کو ملک کی صنعتیں نہیں بھاتیں وہ لکھے گا کہ ملک میں موٹر کار اتنی ناقص بنتی ہے کہ پورا بریک لگانے کے باوجود کار روکی نہ جاسکی۔

یہ مثال اس بات کو اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ واقعہ اور حقیقت ایک ہوتے ہوئے بھی کیسے اسباب جذبوں کے تحت بدل جاتے ہیں۔ (۴)

پروفیسر سبرانیم نے اسی خیال کو یوں لکھا ہے کہ تاریخ نویسی کا انداز تاریخ کے فلسفے اور مورخ کی اپنی ذہنی تربیت پر موقوف ہوتا ہے۔

تاریخ فہمی کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ جو دشواریوں کا باعث بنتا ہے وہ خود پڑھنے والے کی شخصیت سے مربوط ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ تاریخ کی کتاب کے مطالعہ سے قبل ہی تاریخ دان ایک نتیجہ اخذ کرلیتا ہے۔ اپنے نظریئے کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کیلئے وہ تاریخ کی کتابوں کی اوراق گردانی کرتا ہے۔ بکھرے ہوئے تاریخ کے واقعات کو اس انداز سے مرتب کرتا ہے کہ واقعات کا یہ سلسلہ اس کے اپنے نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کا باعث بنے۔ تاریخ دانی کا یہ انداز دور حاضر میں برپا ہونے والے کئی فسادوں کی بنیاد ہے۔ تاریخ کو موڑ توڑ کر پیش کرنا میرے خیال میں تاریخ پر سب سے بڑا ظلم ہے۔ تاریخ انسان کی حرکات اور اس کے عمل کا مرتب افسانہ ہے اسی لئے تاریخ کا نہ اپنا کوئی مذہب ہے اور نہ وہ کسی فلسفے، نظریہ اور عقیدے سے وابستہ ہے۔ یوں ہوسکتا ہے کہ کسی دور کے بادشاہ، اس کے امراء، جاگیرداروں زمینداروں اور عہدے داروں کی بڑی تعداد کا کوئی مذہب عقیدہ یا نظریہ رہا ہو۔ لیکن اس بنیاد پر تاریخ کو مختلف خانوں میں بانٹنا تاریخ پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ تاریخ نہ مسلم ہوتی ہے نہ ہندو۔ تاریخ میں یہ تقسیم اگر روا رکھی بھی گئی ہے تو صرف اس لئے کہ تاریخ کے طالب علم کو مطالعہ میں آسانی ہوسکے۔

مورخ کے لئے صحت مند فکر، وسیع النظری اور انسان دوستی شرط ہے میرے نزدیک وہ تاریخ داں ہی نہیں جو نفرت کا پرچار کرتا ہو جس طرح ہر انسان نیکی اور بدی سے عبارت ہے اس طرح ہر دور میں اچھے اور برے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں صحت مند فکر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان کا صحیح تجزیہ کرکے نتیجہ تک پہنچنے یہ اسی وقت ممکن ہے جب کسی دور سے متعلق لکھی ہوئی مختلف کتابوں کا تقابلی جائزہ لیا جائے۔ صرف ایک ماخذ کو بنیاد بنا کر کسی دور یا کسی شخصیت پر رائے زنی مورخ کے فکری دیوالیہ پن کا ثبوت ہے۔

آج تاریخ کی اکثر شخصیتوں پر شدید مباحث کا باعث یہی دیوالیہ پن ہے۔ کسی بادشاہ

کی پالیسی کا تجزیہ اسی وقت ممکن ہے جب اس دور کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات نظر میں ہوں ورنہ یوں ہوتا ہے کہ یہ پالیسی کا تجزیہ سراسر غلط ہوتا ہے مثلاً محمد قلی قطب شاہ کی مذہبی پالیسی پر لکھے گئے تاریخ کے بہت سارے مضامین خود مورخین کی محدود فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجھے یہاں محمد قلی کی مذہبی پالیسی پر گفتگو نہیں کرنی ہے۔ ایک جملہ میں صرف یہ کہنا ہے کہ محمد قلی نے قانون مذہب میں کوئی تجربہ نہیں کیا۔ لسنے تہذیب مذہب میں ہندوستانی عنصر کو اس نظریہ کے ساتھ ملایا کہ دکن کے مختلف مذہبوں، فرقوں اور ذاتوں میں ملاپ ہوسکے۔

جو سوال بار بار موضوع بحث بنتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا تاریخ کی راہوں پر مورخین کی ٹھوکریں ان کا اپنا اختیاری فعل ہے یا اس کے لئے مضمون کی گنجلک راہیں ذمہ دار ہیں۔ اس سوال کا جواب جانے کتنی بار کتنے مورخین نے دیا ہے لیکن ان جوابات کے درمیان سب سے سادہ سیدھا جواب پروفیسر شیخ علی کا ہے جنھوں نے تاریخ نویسی کے تین سادہ اصول مرتب کئے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے مورخ کا فرض یہ ہے کہ وہ حقیقی واقعہ کو چھان بین کے ذریعہ صحیح صحیح حاصل کرے۔ جب تک اس بات کا تعین نہ ہوجائے کہ مکمل واقعہ اپنی پوری پوری صداقت کے ساتھ دستیاب نہ ہوگیا ہے مورخ کے لئے اگلا قدم اٹھانا جائز نہیں ہے۔

(۲) مورخ کا دوسرا اہم کام ان حقایق اور واقعات کا تجزیہ ہے جو اس نے حاصل کئے ہیں مورخ کا یہ تجزیہ ہی کسی واقعہ یا حقیقت کی اہمیت کے اظہار کا باعث بنتا ہے۔

(۳) تیسرا اہم کام اس واقعہ کا مناسب اور موزوں لفظوں میں اظہار ہے (۱۱) ان سادہ سے لفظوں میں یہاں بتائے گئے اصولوں کو Trevelyon نے یوں لکھا ہے کہ مورخ کو تین اہم فرائض پورے کرنے ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلا سائنٹفک دوسرا تصوراتی اور تیسرا ادبی ہے

تاریخ کیا ہے" کے ایک مختصر سوال پر اتنا کچھ لکھنے کے باوجود بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سب کچھ لکھ دیا گیا ہے سوال کا مکمل جواب دیا جاچکا ہے اس لئے کہ وقت کی ترقی کے ساتھ

ساتھ تاریخ کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے چونکہ تاریخ کے مطالعہ کا مرکز بشر ہے۔ اور بشر ہر دم تبدیلی و تغیر سے مرکب ہے اس لیے تاریخ میں ٹھہراؤ بھی قریب ناممکن ہے

لیکن یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ تاریخ کی اہمیت کو مسلسل گھٹانے کی کوشش کی جارہی ہے اسے ایک ایسا مضمون سمجھا جارہا ہے جسے نہ صرف ہر کس و ناکس سمجھ سکتا ہے بلکہ اس پر رائے زنی کرنے کا بھی پورا حق رکھتا ہے

ادب کیا ہے:۔

ادب اور تاریخ کا باہمی ربط سورج اور زمین کے باہمی رشتہ کی طرح ہے جس میں یہ تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر علحدہ ہونے والے ایک حصے کا نام ہے لیکن یہہ کب ہوا یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ کچھ اسی طرح یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ ادب کے سورج سے جدا ہونے والے حصہ کا نام ہے لیکن زمانے اور وجوہات کا علم صرف قیاس کے دائروں تک محدود ہے۔ زمانہ قدیم کی تاریخ کا ماخذ اس دور کا ادب ہے۔ یہ کوئی بحث طلب مسئلہ نہیں ہے۔ دنیا کے کسی حصہ کی تاریخ سہی عرب ہو کہ ہندوستان، قدیم دور کی تاریخ کا ماخذ بڑی حد تک اس دور کا ادب ہی رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں یہ ادب مذہبی کتابوں کی صورت ادب سے تاریخ میں منتقل ہوا اور کہیں ادب کے دوسرے اصناف جیسے شاعری کے ذریعہ تاریخ دانوں کے ہاتھوں تک پہنچا لیکن زمانے کی گردش نے ادب اور تاریخ کے بیچ ایک خلا پیدا کردیا اور آج یہ دونوں ایک ماخذ کے دو حاصل ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے الگ اپنی اپنی پہچان رکھتے ہیں۔

ادب کیا ہے؟ اور ادب میں وہ خام مواد کیا ہے جس پر ادیب اور اس کی تخلیقی قوتیں کارکرد ہوتی ہیں۔ کافی دلچسپ سوال ہے۔ عابد علی عابد نے اپنی کتاب "اسلوب" میں اس سوال کا جواب یوں دیا ہے۔ " اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ الفاظ ہی ادب کا مواد

خام ہیں تو پھر الفاظ کا بامعنی ہونا ضروری نہیں ۔ صرف یہ کافی ہے کہ وہ اپنی نشست کے اعتبار سے اور آہنگ و ترنم کے پیش نظر حسن کا شعور پیدا کرتے ہوں اور ظاہر ہے یہ بات درست نہیں ہے ۔ اس لئے فنون لطیفہ کی جو صف بندی کی گئی ہے اس میں شعور کو ایک ایسا فن لطیف قرار دیا ہے جو فکر کا ترجمان ہوتا ہے ۔ فکر اپنے دامن میں کوئی ایسی چیز نہیں رکھتی جو حواس اور ادراکات پر مبنی نہ ہو اس لئے فکر کے دائرے آخر جذبات سے جاملتے ہیں ۔ (۱۲)

عابد علی عابد کا تجزیہ اس بات کو مان لینے پر مجبور کرتا ہے کہ ادیب ہو یا شاعر ادب کی صنف کا کوئی نمائندہ وہ بھی سماج کی نمائندگی کرتا ہے اور اس پر بھی تاریخ دان کی طرح سماجی اثرات اور احساسات کا رد عمل ضروری طور پر ہوتا ہے لیکن ماخذ ایک ہوتے ہوئے بھی راہیں بدل جاتی ہیں ۔ مورخ کے برخلاف شاعر یا ادیب حقائق کو بنیاد بنا کر اس پر تخیلات کی ایک عمارت تعمیر کرتا ہے ۔ وہ نہ صرف گذرے ہوئے کل سے آج کو ملاتا ہے بلکہ آنے والے کل سے آج کو مربوط کرتا ہے ۔ شاعر کی فکر دو مختلف سمتوں میں پرواز کرتی ہے ۔ ایک عمودی اور دوسری افقی ۔ اسکی فکر کی عمودی پرواز اسے زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے تو افقی پرواز اس کی فکر کے دائرے میں کائنات کو سمیٹ دیتی ہے لیکن یوں کبھی نہیں ہوتا کہ فکر کی کوئی بنیاد نہ ہو ۔ وہ ضرور ہوتی ہے اور اسی زمانے اور اسی سماج کے کسی حادثہ یا سانحے پر مرکوز ہوتی ہے جو شاعر کے اطراف واقع ہوتا ہے ۔ ایک مورخ کی توجہ کا مرکز کوئی واقعہ اس کے وجوہات اور اثرات ہوتے ہیں ۔ اسے انسانی جذبات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اس کے برخلاف ادیب اور شاعر حقائق کے پس منظر میں انسانی جذبات کا مطالعہ کرتا ہے ۔ کسی واقعہ کا انسان پر جو عمل یا رد عمل ہوتا ہے وہ انہیں لفظوں کا جامہ بخشتا ہے ۔ اس لئے مورخ کے برخلاف شاعر کے لئے ابہام و علائم اس کے فن کا لوازمہ ہوتے ہیں ۔ کسی واقعہ کا صاف صاف اظہار تاریخ کے دائرے میں آتا ہے لیکن اس واقعہ سے ذہنوں پر مرتب

ہونے والے اثرات کا اظہار علائم کے ذریعہ شاعری میں ہوتا ہے اور یہی علائم فن کار کی فکر کو قاری کے ذہن سے مربوط کرتے ہیں۔ اس لئے فن کار مورخ کے برخلاف تخلیق پر یقین کرتا ہے۔

ادب اور تاریخ کا باہمی ربط:

یہ کام محال نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ زمانہ قدیم کی تاریخ اور اس دور کے ادب کا موازانہ کیا جائے۔ اس لئے کہ اس دور کا ادب ہی اس دور کی تاریخ ہے۔ مثلاً ہندوستان کی قدیم تاریخ کا ماخذ اس دور کی مذہبی کتابیں جیسے "وید" ہیں جن سے ان حصوں کو نکال کر جو تاریخ کے دائرے میں آتے ہیں اس دور کی تاریخ مرتب ہوئی ہے۔ مثلاً آریون کے دور میں عورت کے مقام، فرائض اور اس کے حقوق کا علم رگ وید کے اقتباسات سے ہو سکتا ہے جیسے رگ وید میں لکھا ہے کہ عورت جو نازک اور نرم مزاج ہوتی ہے اس نوجوان کو اپنا شوہر منتخب کرتی ہے جسے وہ چاہتی اور جس سے محبت کرتی ہے یا پھر بیوی کی حیثیت میں اس کے فرائض آریون کے عہد میں کیا تھے۔ اس اشلوک سے ظاہر ہوتے ہیں جس میں دلہن کو مخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ۔ اے دلہن تمہارا داخلہ بڑا مبارک ہے گھر کے خدمت گاروں سے چاہے وہ مرد ہوں کہ عورت اچھا برتاؤ کرنا۔ گھر کے پالتو جانوروں کی اچھی نگہداشت کرنا۔

تیسری صدی قبل مسیح تک بھی تاریخ نویسی کے لئے یہی مذہبی کتابیں واحد سہارا تھیں رامائن اور مہابھارت ابتداء میں یوں تو والمیکی اور ویاس نے تحریر کئے لیکن ان میں مسلسل کمی بیشی ہوتی رہی۔ این۔ این گھوش نے Winternitz کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جو رامائن اور مہابھارت ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ دوسری صدی قبل مسیح کی ہے جو بات ان کتابوں کو مورخین کے لئے بہت اہم بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتابیں نہ صرف مذہبی اور ادبی ہیں بلکہ ان میں اس دور کی تاریخ کے کئی ایک پہلو بڑے واضح ہیں۔ اگر انہیں سہارا نہ بنایا جائے تو اس دور کی تاریخ لکھنا قریب ناممکن ہو جائے گا۔ تاریخ نویسی کے لئے ادبی اور مذہبی کتب

ہندوستان کے دور قدیم کے اختتام تک واحد ذریعہ تھیں ۔ موریہ اور گپت دور میں ادب کی ترقی نے تاریخ نویسی کو بڑا سہارا دیا ۔ گپت دور کو سنسکرت ادب کا سنہری دور کہا جاتا ہے لیکن اس دور کے ادیبوں اور شعرا نے کئی تاریخی واقعات کو بھی قلمبند کر کے محفوظ کر دیا ۔ جیسے ہری سینا نے جو ایک مشہور شاعر تھا آلہ آباد کے ستون کا کتبہ تحریر کیا جس میں سمندر گپت کے فتوحات تفصیل سے بیان کئے یہی کتبہ سمندر گپت کے فتوحات کے جاننے کا بڑا ذریعہ ہے ۔ گپت دور کے سب سے عظیم شاعر کالی داس کی نظمیں یقیناً گپت دور کا قیمتی سرمایہ ہیں ۔ جن کی افادیت اب بھی اتنی ہی ہے ۔ تاریخ سے ادب کا یہ ربط صرف ہندوستان کے لئے مخصوص نہیں بلکہ عرب کی ابتدائی تاریخ عرب کے شعرا کے کلام سے اخذ کر کے لکھی گئی ہے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے (Dodweel) ڈاڈویل کا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی مورخین کا ایک اعلیٰ گروہ ابھر کر سامنے آیا جو اس دور کے انگریز مورخین سے بہر طور بہتر تھا ۔ اس لئے کہ یہ لوگ پادری نہ تھے بلکہ اس دور کے اہم واقعات کے کردار تھے لیکن مجھے ڈاڈیل کے اس نظریہ سے ایک تھوڑا سا اختلاف ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ آغاز دور وسطیٰ کے کم از کم چھ مورخین ایسے تھے جن پر مذہبی شدت پسندی کی چھاپ نہ تھی ۔ پھر بھی ان میں سے اکثر سماج کے اس حصہ سے تعلق رکھتے تھے جو امراء کا طبقہ کہلاتا تھا ۔ ڈاکٹر عبد المجیب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ " انکا تخت و تاج سے یہ ربط انہیں اس بات پر مجبور کرنے کا باعث بنا کہ وہ اپنی تاریخ کو بادشاہ اور امراء کے اطراف کھینچے ہوئے دائرے کی شکل دے دیں ۔ ڈاکٹر مجیب کا یہ خیال ہے کہ " اسی وجہ سے آغاز دور وسطیٰ کے مورخین کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ سماجی ضروریات اور اقتصادی حالات کو نہ سمجھ سکے جو سوسائٹی میں تبدیلی لانے کا باعث بنتے ہیں ۔ " میرے اپنے خیال کے مطابق یہ تاریخ کا بہت عظیم خلاء ہے ۔ جسے پر کرنے کی اجکل بڑی شدید کوشش ہو رہی ہے ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آج صدیوں بعد ان حالات کو کہاں تلاش کیا جائے جنہیں مرتب کر کے اس خلاء کو پر کیا جا سکے ۔ میں اس کے لئے اس دور کے ادب کو بڑا سہارا سمجھتا ہوں ۔ اگر اس دور کی ادبی

تخلیقات کو کوئی اس نظریہ سے پڑھے کہ واقعات کے دامن میں چھپے ان حقائق کا پتہ چلایا جاسکے جن کی اساس پر ادیب کے تخیل کی پرواز کا دار و مدار تھا تو تاریخ کا یہ خلاء کسی حد تک پر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ قصہ گوئی ہو کہ شاعری اس کی اپنی کچھ روایات حدود اور لوازم ہوتے ہیں۔ دور وسطیٰ کے اکثر ادیبوں اور شعراء کے کلام میں ان لوازم کی پابندی اتنی شدت سے ملتی ہے کہ ان کے کلام سے اس محرک کا پتہ چلانا ممکن نہیں ہوتا جس کی ضرورت مورخ کو ہوتی ہے۔ پھر بھی جہاں تک سماجی تاریخ کا تعلق ہے آج کا مورخ ادب سے استفادہ کئے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سماج کے مختلف طبقات رسوم و روایات اعتقادات، اصول و ضوابط ادب کے دامن میں محفوظ ہوتے ہیں۔ مثلاً بیجاپور کے ملک الشعراء نصرتی کی مثنوی "علی نامہ" کو لیجئے۔ اگر آپ اسے ایک ادب کے طالب علم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مورخ کی حیثیت سے پڑھیں گے تو آپ کو اس دور کے سماجی حالات کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوں گی لیکن یہ ضروری ہے کہ حقائق کو شاعری کے مبالغے سے کھینچ کر باہر لایا جائے۔

ادب اور تاریخ کے درمیان ایک اور مضبوط رشتہ ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ شخصی آزادی اور سماجی مساوات کا شعور۔ دنیا کی تاریخ جنگوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ان جنگوں میں اتنا خون بہایا گیا ہے کہ اگر اسے ایک جگہ جمع کر لیا جاتا تو عالمی تاریخ اسی خون سے آسانی کے ساتھ لکھی جا سکتی تھی۔ لیکن جنگوں کی خوں ریز تاریخ کا پڑھنے والا جس بات کو نظر انداز کر دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جنگیں کسی ایک فرد سے دوسرے کی لڑائی کی کہانی نہیں ہیں بلکہ یہ انسانوں کے ایک گروہ سے دوسرے گروہ کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ گروہ آپس میں مختلف قوتوں کے اتحاد کی وجہ سے بنتے ہیں۔ وجہ مذہبی ہو سکتی ہے۔ سیاسی بھی اور زر اور زمین بھی۔ ان جنگوں کے رد عمل کے طور پر جو احساسات جاگتے ہیں وہ ادب کا بڑا قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ ادب چاہے وہ شاعری ہو کہ قصہ گوئی تنقید ہو کہ تبصرہ عموماً اس دور کے سیاسی پس منظر کا رد عمل ہوتا ہے۔ اگر آپ جنگوں کے پس منظر میں لکھے گئے ادب کا مطالعہ

کریں تو یہ بات آپ پر یقیناً واضح ہو جائے گی کہ اس دور کے ہر شاعر اور ادیب نے دنیا کو محبت کا پیام دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم ادب کا ایک قابل لحاظ حصہ ان نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے جو قوم اور قبیلہ کے اساس پر نوجوانوں کو ترغیب جنگ دینے کے لئے لکھے گئے لیکن ان میں ادب کا حصہ نہیں بلکہ جنگ کا حصہ تصور کرتا ہوں۔ وہ ہتھیار تھے جن سے معرکے ہو۔ یہ ادب کا اس لئے حصہ نہیں بنتے کے مصنف کے فکر کی اساس ہمیشہ مثبت جذبے پر ہوتی۔ منفی رجحان پر نہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ انسانیت کو شخصی آزادی اور سماجی مساوات سبق دینے والے ادب کی دنیا سے اٹھے جنہیں تاریخ نے بڑھکر اپنے دامن میں لے لیا۔

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ادب اور تاریخ کا رشتہ یک رخی راستہ ہو جس طرح مور کے لئے ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسی طرح ادب کے طالب علم کے لئے تاریخ کا مطالعہ لاز ہے۔ کسی بھی شاعر یا ادیب کے فن کا جائزہ لیا ہی نہیں جا سکتا جب تک اس دور کی تاریخ مکمل مطالعہ نہ کر لیا جائے۔ شاعر ہو یا ادیب حساس فکر اس کا سرمایہ ہوتی ہے اس لئے اب ممکن ہی نہیں ہے کہ اس دور کی تحریکیں اور سیاسی مسلئے اس کی فکر پر اثر انداز نہ ہوں۔ مختصر کہ شاعر ہو کہ ادیب یا ادب کی کسی اور صنف کا فنکار وہ انسان بھی ہوتا ہے۔ اور سماج کا رکن بھی۔ اس لئے اس پر اس دور کے کئی عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ مثلاً اس دور کی سیاسی تحریکیں اقتصادی حالات، سماجی روایات، مذہبی اعتقادات اور ان سے بڑھ کر اس کے اس حکومت کے متعلق نظریات یہ بات مورخ اور ادیب دونوں پر لاگو ہوتی ہے۔ تاریخ کی دنیا میں یہ مان گیا ہے کہ مورخ ان سے آزاد ہو کر نہیں لکھ سکتا اگر یہ سچ ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کو ادیب یا شاعر اپنے کو اپنی دنیا سے جدا کر کے کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اب اگر کسی شاعر کی شاعری ادیب کی تحریروں کا جائزہ لینا ہو تو محقق کے لئے ضروری ہے کہ اس دور کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کرے تاکہ وہ یہ بتا سکے کہ کیا ہو رہا تھا اور فنکار نے کیا لکھا۔ کسی بحث میں گئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی شاعری کی اسٹڈی دو انداز میں ممکن ہے۔ صرف اور صرف شاعری کا مطالعہ غالب کی شاعری کا مطالعہ مغلیہ دور کے زوال کے دوران اشراف کے جذبات و احساسات کے

پس منظر میں ۔ ظاہر ہے دوسرے طریقے کا مطالعہ بہتر طور پر غالب فہمی کا ذریعہ بنے گا ۔ اسی طرح ترقی پسند ادب کا مطالعہ اس دور کی تاریخ کو رد کر کے کیا جائے تو بے معنی ہو گا ۔

لیکن میرے خیال میں جو بات دونوں مضامین کے اسکالرس کے لئے مشکل کا باعث بن رہی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں مضامین میں ریسرچ کی رفتار کافی تیز ہے ۔ نئی تحقیق اور نئے مواد کی اساس نظریات کو بدل دینے کا باعث بنتی ہے ۔ کسی ایک مضمون کے اسکالر کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دو مضامین کی ترقی اور اس میں ہونے والی تحقیق پر دسترس رکھے اس لیے دونوں ہی مضامین کے اسکالرس ٹھوکریں کھاتے ہیں میرے خیال میں اس کا واحد حل یہی ہے کہ دونوں مضامین کے اسکالرس کے درمیان ربط اور مضبوط ہو اور دونوں اپنی تحریروں سے ایک دوسرے کو اپنے مضمون کی نئی دریافتوں کے متعلق معلومات پہنچاتے رہیں ۔

تاریخ اور ادب کے باہمی ربط کی ایک دین وہ قصے کہانیاں ہیں جن میں کرداروں کے نام تو تاریخی ہوتے ہیں لیکن واقعات فرضی ۔ اکثر یہ کہانیاں اور قصے جن میں تاریخی ناولوں کی کافی تعداد ہے ۔ تاریخ فہمی میں مسائل پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں ۔ بعض فرضی قصے تو اس حد تک صحیح مان لئے گئے ہیں کہ مورخین کی مسلسل کوشش کے باوجود بھی انہیں تاریخ کا جز مانا جاتا ہے ۔ مثلاً بھاگ متی کا واقعہ ۔ ادب کے لئے یہ خاصے کی چیز ہے لیکن مورخین کی بہت بڑی تعداد اسے صحیح نہیں مانتی ۔ تاریخی کہانیوں اور ادب کا یہ باہمی ربط بیسویں صدی کے آخری نصف سے بہت کم ہو گیا ہے اور یہ جتنا کم ہو اتنا ہی بہتر ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تاریخ اور ادب کے ربط کو جو ایک مضبوط رشتہ میں بندھا ہے ۔ جدا جدا کر دیا جانا چاہیے ، یہ دونوں مضمون ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور رہیں گے ۔

اقتباسات

۱۔ E.H.Carr ; What is History, England 2nd Ed 1987 ص ۔ ۸

۲۔ Shaik Ali ; History its theory and method ص ۔ ۱۰

۳۔ شیخ علی ؛ ص ۱۱

۴۔ شیخ علی; ص ۴

۵۔ شیخ علی; ص ۵

۶۔ Carr ; ص ۹

۷۔ Prof. N. Subramanium ; Historiography تامل ناڈو 1978 ص ۲۳

۸۔ سبرامنیم; ص ۲۳

۹۔ شیخ علی; ص ۵

۱۰۔ Carr ; ص ۱۷

۱۱۔ شیخ علی; ص ۱۱

۱۲۔ عابد علی عابد اسلوب ص ۱۶

۱۳۔ Dr. Abdul Mujeeb ، Historians of India ، Delhi ، ص ۳۲

۱۴۔ ڈاکٹر مجیب، ص ۳۳

فیض کی شاعری کا تاریخی پس منظر

اردو میں کسی شاعر پر مضمون لکھنے کا روایتی طریقہ یہ ہے کہ اسکی زندگی کے خاکے سے مضمون کا آغاز ہو۔ جیسے مجھے مضمون کا آغاز یوں کرنا چاہیئے کہ فیض ۱۳۔ فروری ۱۹۱۱ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سلطان احمد خاں تھا جو بیرسٹر تھے۔ فیض کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انگریزی میں ایم۔ اے کی ڈگری لاہور سے حاصل کی۔ شاعری میں اپنے ابتدائی دور میں غلام مصطفےٰ تبسم سے اصلاح لی لیکن میں اردو کے اس روایتی انداز سے گریز کر رہا ہوں اسلئے کہ فیض کو یہ انداز پسند نہیں تھا اسلئے خود لکھا ہے۔

"اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے وحشت ہوتی ہے اسلئے کہ سب بور لوگوں کا شغل یہی رہا ہے بلکہ میں تو شعر میں بھی حتی الامکان متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا بلکہ میں کے بجائے ہم لکھتا آیا ہوں"

یوں بھی اس فیض کی زندگی کا آغاز جس کی فکر نے کائنات کا احاطہ کیا اور جسکے کلام نے اسے زمانے کی قید سے آزادی دی وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں اس نے وقت کی موجوں کے ارتعاش کو محسوس کرنے اور انسانی سماج میں بدلتے اور ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو پہچاننے کا شعور پایا۔ فیض کی زندگی کا آغاز ۱۹۳۴ء میں امرتسر سے ہوتا ہے جہاں وہ ایم۔ اے۔ او اردو کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ خود فیض نے اسکا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے "میری اور میرے بہت سے ہم عصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا آغاز یہیں سے ہوا۔ اسی دور میں ترقی پسندی کی داغ بیل پڑی۔ مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا جیسے ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہوں۔ ترقی پسند تحریک کے دبستان میں سب سے پہلا سبق جو فیض

نے سیکھا وہ یہ تھا کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا ممکن نہیں۔ اسلیئے کہ اس ؛ بہرحال گرد و پیش کے سب ہی تجربات شامل ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ممکن بھی ہو تو انتہائی سود مند فعل ہے کہ ایک انسان کی ذات اپنی سب محبتوں، کدورتوں، حسرتوں اور رنجشو کے باوجود بہت ہی چھوٹی بہت ہی محدود اور حقیر شئے ہے۔ اسکی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ باقی عالم موجودات سے اسکے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں۔ خاص طور سے انسانی برادری مشترکہ دکھ درد کے رشتے" (۱)

فیض کے یہ جملے ایک شاعر کی شخصیت اور فن کو پرکھنے کا معیار بھی ہیں اور اس شخصیت سے اس کے فن کے رابطہ کا اندازہ لگانے کا پیمانہ بھی ادب برائے ادب یا ادب برا زندگی کی بحث میں الجھے بغیر جس پر ماضی میں اٹھنے والے طوفانوں کی گہری گرد بھی ہے مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ شاعری ہو کہ کوئی اور فن اسوقت تک کمال کو نہیں پہنچتا جب تک ک ذات اور فن کا فاصلہ ختم نہ ہوجائے۔ جب تک کسی شاعر کی ذات اسکے فن میں یوں جذب نہیں ہوجاتی کہ دونوں کا الحاق ایک اکائی میں بدل جائے۔ اسکی شاعری نہ پیغام بنتی ہے اسکی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ شاعر اپنی ذات کے دائرے میں سماج کا نمائندہ ہوتا ہے اسلیئے سماج میں ہونے والی ہر تبدیلی اور اسکی فکر کے احاطے میں ہونے والا ہر حادثہ اسکو یقینی طور پر متاثر کرتا ہے۔ یہ تاثر عام انسانوں کی بہ نسبت شاعر میں زیادہ ہی گہرا ہوتا ہے اسلیئے کہ شاعر کے لئے حساس دل اور بیدار فکر بنیادی ضروریات ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز کا سب سے عظیم ادبی انقلاب اس دور میں صاحبان قلم کی واضح معنوں میں تقسیم تھا۔ ایک گروہ وہ تھا جو سماجی اور سیاسی مسائل سے گھرے ہوئے ہونے کے باوجود خود کو خیالی اور غیر حقیقی دنیا سے مربوط رکھنا چاہتا تھا۔ اس گروہ کیلئے انسانی مسائل سماجی اور سیاسی تبدیلیاں غیر اہم تھیں۔ شاعر کا منصب انکے لئے ان مسائل سے فرار

یک خیالی دنیا کی تخلیق تھا۔ لیکن دوسرے گروہ نے صاحبان قلم کی ذمہ داریوں پر زور
اس گروہ کے شعراء اور ادیب اپنے کو سماج کا ذمہ دار فرد سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے
کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی اپنا فرض سمجھا۔ اس گروہ کو اردو ادب کی تاریخ نے
پسندوں کا نام دیا ہے۔ فیض نے اپنے قابل قدر مقالے "ترقی پسند تنقید" میں اس نظریہ کو
، واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو (۱) سماجی ترقی
مدد دیں (۲) ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں۔ سماجی زندگی کے کئی شعبے ہیں۔ ظاہر ہے
، کا تعلق زندگی کے اس شعبے سے ہے جسے کلچر یا تہذیب کہتے ہیں اور اگر ہم ادب سے سماجی
میں مدد چاہیں تو اس ترقی سے ہمیں کلچر یا تہذیب کی ترقی مراد لینا چاہیئے۔ کلچر ذرا مبہم لفظ
۔ کلچر سے اقدار کا وہ نظام مراد ہے جسکے مطابق کوئی سماج اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے۔
وا میں معلق نہیں رہ سکتا اور ایک مخصوص سماج کے بغیر اسکا وجود ذہن میں آنا محال ہے

کلچر ہماری زندگی کا ایک ضابطہ ہے۔ اس لئے اسکی نوعیت اسکی ترقی اور تنزل بھی انہی
ں کے قبضہ میں ہے جو سماج پر حکمرانی کرتی ہیں۔ یہ قوتیں سیاسی اور اقتصادی ہیں۔ پس
، قوم کے کلچر کا اسکے سیاسی اور اقتصادی نظام پر انحصار ہے۔ (۲) شاعر زندگی کے مثبت
روں کا علمبردار ہوتا ہے۔ ظلم چاہے کہیں کسی صورت میں ہو شاعر کیلئے قابل قبول نہیں
ا۔ ظلم کے خلاف اپنی آواز کو اپنے فن کے سہارے وہ دنیا تک پہنچاتا ہے ظلم چاہے سماجی ہو
صادی ہو کہ سیاسی شاعر سے اسکا سمجھوتا ناممکن ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے جس دور میں
ں اور انکے ساتھیوں نے ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھایا وہ دور سماجی اور سیاسی اعتبار
، بڑا کٹھن دور تھا۔ اسلئے اس دور کا ایک مختصر سا تاریخی جائزہ لئے بغیر ترقی پسند تحریک کی
یت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔

IMPERIALISM امپیریل ایزم ہندوستانی تاریخ کا وہ باب ہے جو صدیوں پر محیط

ہے ۔ہمیشہ ہی سے ہندوستان پر غیر ملکیوں نے حکومت کی ۔آریا، عرب، ترک، افغان ،
پرتگیزی اور فرانسیسی اقوام کی حکومت ہندوستان کے کسی نہ کسی حصہ پر مختلف ادوار میں
رہی ۔لیکن ہندوستانی عوام نے آزادی کا نعرہ کبھی بلند نہیں کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ
کا تصور بھی ہندوستان کی دھرتی پر ناپید تھا، لیکن برٹش امپریل ازم کا نہج ان سب سے مختلف
امپریل ازم کے ساتھ جب انگریزوں نے Economic Exploitation کو مربوط
ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی ابتر ہو گئی ۔غریب محتاج مزدور مفلس اور
کش بیکار ہو گئے ۔انیسویں صدی کے آغاز تک آتے آتے یہ ظلم و ستم کا طوفان اپنی ا
حدوں تک پہنچ گیا۔

ہندوستان ایک زرعی ملک تھا اسلئے آبادی کے بڑے حصہ کا پیشہ زمین سے وابستہ
اسلئے ہر دور میں حکومت نے سب سے زیادہ توجہ Land Revenue System
تھی ۔زمین چاہے کسی کی بھی ہو محنت کا حق کبھی مزدور سے چھینا نہیں گیا تھا۔صدیوں کا ف
طے کرتا ہوا یہ نظام تجربات کے دھارے سے ہوتا ہوا جب مستقل ہوا تو اس نے گاؤں
سماج کو ایک ایسا ڈھانچہ دیا، جسکے اقدار جانے پہچانے اور مانے ہوئے تھے ۔لیکن انگریز
نے اس مسئلہ کو اپنے تجربات کا نشانہ بنایا۔کلائیو نے دوہرا انظام رائج کیا تو وارن ہیسٹنگ
بدل کر اسے پانچ سالہ معاہدہ میں تبدیل کیا۔۱۷۷۲ء میں اس مسئلہ کے تحت زمینوں کا ن
کیا گیا اور محصول کی ادائیگی کی سب سے زیادہ بولی لگانے والے کو زمین دے دی گئی ۔
سسٹم کی بے حساب خرابیاں تھیں لیکن سب سے بڑی خرابی جس نے گاؤں کے صدیوں پر
سماجی ڈھانچے کو وہلا دیا۔یہ تھی کہ ہراج کے سہارے یکایک بننے والے زمینداروں نے غر
کسانوں کا دل کھول کر استحصال کیا ۔نہ انہیں زمین کو ترقی دینے کی فکر تھی نہ مزدوروں
فلاح و بہبود کی وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ پانچ سال بعد انکی زمینداری باقی بھی رہے

نہیں ۔لارڈ کارنوالس نے ۱۷۹۳ء میں اس سسٹم کو تبدیل کیا۔

کارنوالس نے زینداروں کو زمین کا مستقل مالک بنادیا، اور محصول کو ہمیشہ کے لئے قائم کر دیا ۔اس سسٹم نے غریب کاشتکاروں کی زندگی پر اور بھی ظلم ڈھایا ۔ زینداروں کو کھلی آزادی ملی کہ وہ کاشتکاروں سے جتنا محصول چاہیں وصول کریں ۔اس دور میں زینداروں کے کاشتکاروں پر ظلم و ستم کی داستانوں سے تاریخ ہی نہیں اس دور کا ادب بھی بھرا پڑا ہے اسلئے میں انکی تفصیلات میں نہیں جاؤنگا ۔یہ سسٹم انگریزوں کی حکومت تک ہندوستان میں باقی رہا، اگرچہ کہ اسمیں معمولی تبدیلیاں کی گئیں ۔

ہندوستان کی اکثریت کے لئے روزی روٹی کا سہارا زمین کے علاوہ صنعتیں تھیں ۔ لیکن ہندوستان پر حکومت کے قیام کے بعد انگریزوں نے جو سب سے پہلا قدم اٹھایا اسے ڈاکٹر ریگانی نے یوں بیان کیا ہے ۔

One of the first act of great Britain after if assumed the complete political power over India was to expose Indian economy to the competition of European Markets that were highly industrialised and also to introduce a uniform system of capitalist economy in the country. This resulted in the complete dissappearance and disorganisation of old economic order, the whithering of Indian indigenous industries.

ہندوستان کی روایتی صنعتوں کا جو حال بھی ہوا وہ بہر حال ہوا ہی لیکن ہندوستان میں Capitalist System کے آغاز نے ہندوستانیوں کو شدید نقصان پہنچایا

جب ہندوستان میں فیکٹریوں کا قیام عمل میں آیا تو اسی کلاس کے نمائندوں نے مزد
لہو کو سکون میں بدلنے کے فن کو اپنایا۔ انگلستان نے صنعتی انقلاب کے آغاز میں جو
تھے ہندوستان میں وہی مناظر پھر سے دہرائے گئے۔

روزی روٹی سے ہندوستانیوں کا یہ کاروان اپنے مصائب کو سینے سے لگائے
ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ حساس دل دھڑکتے رہے اور روشن آنکھیں ان مناظر کو دیکھ
گئیں۔

معاشی بدحالی کا غم اور بھی بڑھ گیا۔ جب پاؤں میں پڑی ہوئی غلامی کی زن
قدم قدم چلنا دوبھر کر دیا۔ ہندوستانی سماج کے چہرے پر بکھرے اندھیرے اور
ہوگئے تو ہندوستان کے صاحبان فکر و نظر کو صدیوں کی نیند سے جاگنا پڑا۔ انیسویں ص
کے ساتھ ساتھ صدیوں کا ظلم سورج کی پہلی کرن کیساتھ پگھلتے ہوئے برف کیطرح
ہونے لگا۔

ہندوستان نے کروٹ بدلی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی اصلاحات کا منظر کھ
اور سماجی اصلاحات کیلئے انجمنیں بنیں۔ برھما سماج کو ۱۸۲۸ء میں راجہ رام موہن
قائم کیا۔ دیویندر ناتھ ٹیگور، کیشب چند سین اور سیوا ناتھ شاستری نے اسے بعد میں
دی۔

آریہ سماج دیوانند سرسوتی نے بنائی۔ رام کرشنا مشن کا آغاز رام کرشنا پرماہنـ
دیوکانند نے اسے وسعت بخشی۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی مادام el Eleatt
Blovtsby کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ یہ سب سوسائٹیاں اگرچہ کہ فضول رسم و
مذہب کے دائرے سے نکلنے کے لئے بنائی گئی تھیں لیکن انہیں سوسائٹیوں
اصلاحات کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ چھوت چھات کا خاتمہ، ذات پات کے نظام کا خل

عورتوں کے سماجی رتبہ کا ارتقاء وہ بنیادی مسائل تھے جن پر ان سوسائٹیوں نے اپنی توجہ مرکوز کی ۔ یہ سوسائٹیاں کتنی کامیاب رہیں یہ سوال الگ ہے لیکن انہی سوسائٹیوں کے پلیٹ فارم نے ہندوستان کیلئے مکمل آزادی کا نعرہ لگانے میں مدد دی ۔

سماجی اور مذہبی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں سیاسی شعور پیدا ہوا ۔ اس باب کا آغاز ہندوستان کی اس نوجوان نسل نے کیا جو انگریزی تعلیم سے آراستہ تھی ۔ انگریزی سے واقفیت نے انکے لئے مغرب کے وہ راستے کھولدیئے جن سے آزادی ، جمہوریت ، مساوات اور خود مختاری کے پیام ساری انسانیت کے لئے نشر ہو رہے تھے ۔ انہوں نے انقلاب فرانس ، جنگ آزادی امریکہ ، انقلاب ترکی کی داستانیں پڑھیں ۔ وہاں کے صاحبان فکر و نظر کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور انکے پس منظر میں ہندوستان کا جائزہ لیا ۔ اس کا نتیجہ اس کشمکش کے آغاز کی صورت میں برآمد ہوا جس نے ہندوستان کو شاہی کی زنجیروں سے نجات دلائی ۔ ہندوستان میں سیاسی شعور کی بیداری اور اس کے ارتقا کی تاریخ بہت تفصیل چاہتی ہے ۔ لیکن اس کے ایک سرسری خاکے کا آغاز یوں کیا جا سکتا ہے کہ ابتداء میں تشکیل پانے والی سیاسی انجمنوں کی سامنے سوراج کا کوئی تصور نہیں تھا ۔ ۱۸۵۳ء میں ممبئی اسوسیشن اور مدراس نیٹو اسوسیشن کا قیام عمل میں آیا ۔ ۱۸۵۸ء میں برٹش انڈیا اسوسیشن اور ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قایم ہوئیں ۔ یہ ہندوستان میں سیاسی جدو جہد کا ابتدائی دور تھا ۔ وقت گذرنے کے دھارے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی کشمکش آزادی نے شدت اختیار کی ۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک وندے ماترم تحریک چلائی گئی ، جسنے ہندوستان کے ایک قابل لحاظ حصہ پر اثر چھوڑا ۔ اس کے فوری بعد ۱۹۱۶ء میں ہوم رول تحریک کا آغاز ہوا ۔ اینی بسنٹ اور تلک کی انتھک کوششوں نے دو سال تک اس ہندوستان گیر تحریک کی رہنمائی کی ۔ جدو جہد آزادی کا کارواں اپنے راستے پر رواں دواں تھا کہ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ پاس ہوا ۔ اس ایکٹ نے ایندھن میں چنگاری کا کام کیا ۔ اس ایکٹ کی

رو سے ہندوستانیوں کی شخصی آزادی چھین لی گئی۔ حکومت نے پولیس کو یہ اختیار دیا کہ کسی بھی شخص کو جو حکومت کے خلاف کسی سازش میں ملوث محسوس کیا جائے قید کر لے ایسے شخص کا مقدمہ ایک اسپیشل کورٹ میں چلایا جائے اور اسے جو چاہے سزا دی جائے۔ ا ایکٹ نے ہندوستانیوں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ حکومت کے خلاف عدم تعاون کا ن لگائیں۔ گاندھی جی نے مارچ ۱۹۱۹ء کو اس ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کا اعلان کیا۔ سارے ملک میں برٹش قانون کو توڑنے کی قسم کھائی گئی۔ ہڑتالوں کا ایک جال بچھ گیا۔ ان ہڑتالوں درمیان ۱۳/ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں جلیان والا باغ کا المیہ ہوا۔ جس میں جنرل ڈائر نے امن جلسے پر گولیوں کی بارش کر دی۔ چار سو آدمی مارے گئے اور تقریباً بارہ سو زخمی ہوئے سارے ملک میں اس ظلم کے خلاف نفرت کا ایک طوفان اٹھا۔ جس کے جواب میں انگریز حکومت نے لاہور امرتسر اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ کشمکش آزادی کا بڑھتا ہوا یہ کاروان یہاں سے تقسیم ہو کر دو راستوں پر چل نکلا۔ ایک راستے کو آزاد کے ان متوالوں نے اختیار کیا جو حصول آزادی میں تشدد کے سخت خلاف تھے تو دوسرے راستے پر وہ آگے بڑھے جو گولی کا جواب گولی سے دینے کے قائل تھے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک کا زما ان جان فروشوں کے کارناموں سے عبارت ہے جنکے درمیان Consipiracy Case ذکر بھی آتا ہے۔ جس میں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ کانگریس نے انہی دنوں اپنے لاہور سیشن میں مکمل آزادی کی تحریک پاس کی اور ۲۶/ جنوری ۱۹۳۰ء پہلا یوم آزادی منایا گیا۔ انگریزی حکومت کے علمبرداروں اور آزادی کے متوالوں کے درمیان ان حالات میں بھی کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور یہ ممکن بھی نہ تھا اس لئے ۱۹۳۰ء میں سیول نافرمانی تحریک کا سلسلہ شروع ہوا جو ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ اس دور کا دوسرا اہم پہلو اس دور میں کشمکش آزادی کے کاروان میں مزدوروں کی شرکت ہے۔ کسان سبھا، پنجاب

بنگال اور اترپردیش میں بنائی گئی۔ ہردولی کی مشہور ستیہ گرہ جس میں کھیت مزدوروں نے بھرپور حصہ لیا اس تنظیم کا کارنامہ ہے۔ کھیت مزدوروں کے دوش بدوش کارخانوں کے مزدوروں نے بھی اپنی ٹریڈ یونین بنالیں۔ ۱۹۲۰ء میں پہلی آل انڈیا ٹریڈ یونینس کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ ٹریڈ یونینوں کی بڑھتی ہوئی پرجوش تنظیموں کو ختم کرنے کی حکومت نے پوری کوشش کی اور ۱۹۲۹ء میں پبلک سیفٹی بل پاس کیا۔ لیکن یہ تحریک آزادی کسی بھی قانون سے روکی نہ جاسکیں۔ ہندوستان کے سیاسی حالات ان طوفانوں کی زد پر تھے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ لارڈ LINLITHGOW نے جو اسوقت ہندوستان کے وائسرائے تھے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان چونکہ مملکت برطانیہ کا حصہ ہے اسلئے اس جنگ میں شریک ہے۔ لیکن کانگریس نے اعلان کیا کہ ہندوستان اس جنگ میں شریک نہیں ہوسکتا جو جمہوریت کے لئے لڑی جارہی ہے کیونکہ خود ہندوستان آزادی کی نعمت سے محروم ہے۔ انگریزی حکومت کی ساری کوششوں کے باوجود بھی ہندوستانیوں کو اس بات پر رضامند نہ کیا جاسکا کہ وہ جنگ میں حصہ لیں۔ اس سلسلے میں رشوت دینے کی ساری کوششیں بھی ناکام ہوگئیں۔

ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا یہ سرسری جائزہ میں نے اس مقصد کے تحت پیش کیا ہے کہ میں صاحبان فکر و نظر سے یہ پوچھ سکوں کہ ان حالات میں ایک ادیب و شاعر کا کیا فرض بنتا ہے۔ کیا اسے خود کو تمام حالات سے الگ کرکے اپنی خیالی دنیا بسالینا چاہئے یا ان تحریکوں میں بھرپور حصہ ادا کرنا چاہئے ظاہر ہے اسکا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے وہ ادیب یا شاعر ہی نہیں ہے جو انسانیت کی بھلائی، آزادی اور حقوق کے حصول کی کشمکش کو اپنے فن سے مہمیز نہ کرے۔ اردو ادب کی تاریخ میں انہی شعراء اور ادیبوں کو ترقی پسند اور انکی مثبت کوششوں کو ترقی پسند تحریک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ دانشور اس دور کے وہ

باصلاحیت افراد تھے جنہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو نہ صرف سمجھا بلکہ انھیں طوفانوں پورا کیا۔ اپنے پہلے ہی مینی فیسٹو میں انہوں نے یہ اعلان کیا کہ

"ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں پرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ٹوٹتی جا رہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیت کا لباس دیں اور ملک کی تعمیر وترقی میں معاون ثابت ہوں۔" (۴)

ترقی پسند ادیبوں نے اپنے ادب کی بنیاد ہی عوامی مسائل کو قرار دیا۔ انکے ادیب کی سماجی اور سیاسی تحریکوں اور حصول آزادی کی تمام کوششوں میں اپنے فن ۔ معاونت ضروری تھی۔ اسکا اظہار انکا پہلا مینی فیسٹو تھا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہئے اور وہ ہے ہماری بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی نظام کا سوال۔ ہم اسی وقت مسائل کو سمجھ ۔ اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگی۔ ترقی پسندوں کے اس اعلان نے جہاں اردو بو۔ ایک قابل لحاظ حصہ کو یقین دلایا کہ وہ بھی انقلاب کی تحریک میں برابر کے شریک ہیر مخالفتوں کا ایک طوفان بھی کھڑا ہوا۔ ان پر الزامات لگائے گئے۔ ان الزامات میں ۔ واضح الزام یہ تھا کہ ان کا ادب بے راہ روی کا شکار ہے۔ وہ سیاسی نعرہ بازی اور اشترا۔ علاوہ نہ کچھ لکھتے ہیں اور نہ لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ ترقی پسندوں نے اپنی پہلی کانفرنس میں ہی جو ۱۹۳۶ء کے دوران لکھنو میں منعقد ہوئی تھی یہ واضح کر دیا تھا کہ

"ہم علانیہ اور دانستہ طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا رشتہ آزادی اور جمہوریت کی تحریکوں کے ساتھ جوڑنا چاہتے تھے کہ ترقی پسند

دانشوروں، مزدوروں، غریب کسانوں اور مظلوم عوام سے ملیں
اور انکی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں۔" (۵)

ظاہر ہے ہندوستان کے سیاسی اور سماجی مسائل کے حل کرنے کے راستے کا انتخاب مختلف ہو سکتا تھا۔ ان ہی راستوں میں سے ایک راستہ کمیونسٹ آئیڈیالوجی پر ایقان بھی تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی ایک قابل لحاظ تعداد نے اسے اپنایا لیکن انکے سامنے جو مقاصد تھے وہ واضح بھی تھے اور صالح بھی۔ اور یہ مقاصد عوام کی تمناؤں کے خلاف نہ تھے۔ فیض نے ان اعتراضات کا بہت مختصر اور واضح جواب دیا ہے۔

"ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری بنیادی مقصد بنیادی سماجی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے ان مسائل میں غالباً طبقاتی کشمکش اور دنیاوی آسائشوں کی تقسیم سب سے زیادہ اہم ہے ادب کا جو نمونہ آپ سے کوئی تجربہ کوئی نظریہ کوئی حقیقیت منوا نہیں لیتا (ایک لمحہ کیلئے سہی) وہ بحیثیت ادب کے خاک بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ (۶)

اسی مضمون میں آگے چل کر فیض نے اس بات کا جواب دیا ہے کہ ترقی پسند ادیب زیادہ تر مزدوروں کے بارے میں کیوں لکھتے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ "مزدوروں اور کسانوں کی کہانیاں لکھنے سے ترقی پسند مصنفین کو نہ نمائش اور فیشن پرستی مطلوب ہے نہ مغرب کے چند ادیبوں کی اندھا دھند تقلید سے واسطہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مزدوروں اور کسانوں کے مسائل ہمارے سماج کے بنیادی مسائل ہیں اور انہیں حل کئے بغیر ہمارا سماج آگے نہیں بڑھ سکتا۔ (۷) فیض کی شخصیت کا سب سے قابل لحاظ پہلو یہ ہے کہ فیض نے زندگی کے کسی حصے میں اپنی آئیڈیالوجی میں تبدیلی نہیں کی۔ وہ امرتسر کالج کے لکچرر تھے۔ جب انکی ملاقات سجاد ظہیر سے ہوئی جو وہاں رشید جہاں اور انکے شوہر محمود الظفر کی دعوت پر آگئے تھے۔ فیض نے انہیں لاہور بلایا اور لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ عبدالمجید سالک، چراغ

حسن حسرت، بشیر احمد صوفی، غلام مصطفےٰ تبسم، فیروز الدین منصور، اختر شیرانی وغیرہ ا؛
سے وابستہ ہوئے۔ صوفی، غلام مصطفےٰ سکریٹری منتخب کیے گئے (۸)۔ انجمن سے وابستہ ہو
کے بعد فیض نے کالج کی نوکری چھوڑ دی اور صحافت سے منسلک ہوگئے۔ دہلی اور پنجاب
رسائل توجہ کا مرکز بنے۔ دہلی سے خود بھی ایک رسالہ نکالا۔ فیض کی انجمن سے یہ وابستگی
مکمل اور معتبر تھی کہ فیض کا فن اور انکی شخصیت کا ہر وصف اسمیں جذب ہوگیا۔

انکی شاعری کا قابل قدر حصہ اسی کی غمازی کرتا ہے۔ مجھے تو فیض کے کلام کی اہمیہ
یوں بھی لگتی ہے کہ انکا کلام اس دور کے سماجی سیاسی اور معاشرتی حالات پر ایک حساس فکر
گہری نظر رکھنے والے دانشور کا رد عمل ہے اور آپ آسانی سے فیض کی شاعری کو اس دور
تحریکوں کے ساتھ سلسلہ وار منطبق کر سکتے ہیں مثلاً ابتدائی دور کی ان کی نظم "مجھ سے پہلی
محبت میری محبوب نہ مانگ" کہ یہ دو بند

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم واطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتے ہوئے گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

یا "چند روز اور مری جان" کے یہ اشعار

اور کچھ دیر ستم سہہ لیں تڑپ لیں رولیں
اپنے اجداد کی میراث سے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر مجبور ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جسمیں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

اسکے علاوہ انکی نظمیں جیسے "ہم لوگ" "یاس" "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" وغیرہ اس دور کے تاریخی پس منظر میں وہ شاہکار ہیں جن سے نہ صرف ادب بلکہ تاریخ کا ایک طالب علم سماجی اور سیاسی تحریکات کے دانشوروں پر اثر کا بڑا مکمل جائزہ لے سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض نے نہ صرف ترقی پسند شاعری کو نوازا بلکہ جدید شاعری میں شاعر کے منصب کو اعزاز دیا۔ یہ نہیں ہے کہ آزادی ہند کے بعد اپنے کاروان کے دوسرے بہت سارے شعراء کی طرح فیض نے شاعری کے اس نہج کو ترک کر دیا ہو بلکہ یوں ہے کہ آزادی کے بعد جو ظلم کے طوفان اٹھے اور جس انداز سے آزادی کی سحر کو رات کی تاریکیوں کے دامن میں ڈھکیل دیا گیا۔ اس سے

فیض زیادہ ہی متاثر ہوئے۔ وہ خواب جو انہوں نے دیکھے تھے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے تو ف
دل ٹوٹ گیا۔ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح آزادی پر انکی نظم کے یہ اشعار اسکے گواہ ہیں

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جسکا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جسکی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

فیض نے اپنے قلم کو اپنی زبان بنا کر ہر لمحہ مظالم کے خلاف اپنی آواز بلند کی ۔ و
راستے پر کبھی نہ تھکے نہ مضمحل ہوئے ۔ ظلم کا تازیانہ انہیں نیا عزم اور ستم ہر دور میں ا
ہمت دیتا رہا ۔ آزاد ہند کی تقسیم دونوں ملکوں کی سرحد پر بہتا ہوا معصوم انسانوں کا لہو
کے ایک ٹکڑے اور کچلے ہوئے انسانوں کے ایک شہر کے لئے جنگ نہ جانے کتنے ایسے حا
تھے جنہیں فیض نے بہ چشم نم دیکھا ۔ وہ شاعر تھے ۔ اپنے غم کو لفظوں میں ڈھالنا انکا فن تھ
کچھ انہوں نے محسوس کیا اسے جرات کیساتھ لکھا ۔ زندگی بھر کی مسلسل کاوشوں اور
اقدار کے پرچار کا صلہ فیض کو جیل کی صورت میں ملا ۔ میں یہاں ان واقعات کو نہیں د
چاہتا جس سے اردو ادب کا ہر طالب علم اچھی طرح واقف ہے ۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا
کہ کوئی اور ہوتا تو ان حالات میں چور چور ہو جاتا لیکن فیض کی جرات اور استقلال کا ثبوت
ہے کہ وہ جیل کی چار دیواری میں بھی عوام کی طاقت سے کبھی مایوس نہ ہوئے ۔ نہ انکا ل
لہجہ بدلا نہ انکی امیدیں ٹوٹیں ۔ زندان نامے کا ایک ایک شعر فیض کی شخصیت اور انکے حید
کا آئنہ دار ہے مثلاً " یہ فصل امید ہمدم " کے یہ دو بند

یہ فصل امیدوں کی ہمدم

اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی
کھیتی کے کونوں کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلے رت کی فکر کرو

یا پھران کی نظم "ملاقات" کے یہ اشعار

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہر خوں جو مری صدا ہے
اسی کے نالے میں نور گر ہے
وہ موج زر جو تری نظر ہے
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم جو اس رات کا شہر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے

یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

فیض کو سمیٹ کر کسی ایک ملک یا کسی ایک قطعہ زمین کا شاعر قرار دینا ان پر ظلم وہ ساری انسانیت کے علمبردار تھے۔ زمین کے کسی خطہ پر کہیں بھی کوئی ظلم ہو وہ تڑپ ا تھے اور انکا قلم مظلوموں کی حمایت میں چلنے لگتا تھا۔ ان کے کلام میں ایسی نظمیں ملتی ہیں جو بات کا ثبوت ہیں مثلاً "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" "روز بزرگ جوڑے کی بے م قربانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ ایرانی شہنشاہیت کے دور میں ایرانی محبان وطن کو گو نشانہ بنانے کی روداد پڑھ کر انہوں نے اپنی نظم "آخری رات" لکھی۔ فلسطین کے مجاہدوں انکا ربط بہت گہرا تھا۔ بلکہ وہ ذہنی طور پر انکی جدوجہد میں شامل تھے۔ دو نظمیں فلسطین ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لئے ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لئے انکی وہ نظمیں ہیں۔ انکے حدود شاعری میں کائنات کو سمیٹ لینے کا ثبوت بنتی ہیں۔

فیض کی شاعری کا دوسرا رخ انکی غزل کی شاعری ہے۔ انہوں نے غزلیں قابل لحاظ تعد میں کہیں لیکن غزل کے علامات، اسکے ڈکشن اور فارم کو جوں کا توں رکھنے کے باوجود انہوں غزل کے کینوس کو بڑی وسعت دی۔ انکی غزلوں پر گفتگو کے لئے ایک اور مضمون درکار۔ اسلئے میں اسے یہاں نہیں چھیڑوں گا۔ فیض کی شاعری کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے کبھی ادب کے حدود سے باہر قدم نہیں نکالا۔ خود انہوں نے لکھا تھا کہ ترقی پسند ادب صرف ترقی پ نہیں ادب بھی ہے۔ اسلئے انکی شاعری میں نہ آپکو غیر مانوس ترکیبیں ملیں گی نہ وہ علامتیں مزاج غزل سے ربط نہیں رکھتیں۔ انکی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے آل احمد سرور نے لکھا تھا "فیض کی حسن کاری اسکی شیرینی اور نغمگی ہمیں سلاتی نہیں جھنجھوڑتی بھی نہیں۔ یہ بڑی سادہ پرکار ہے۔ یہ چپکے چپکے ہمیں ایک خاموش عزم عطا کرتی ہے۔ یہ ہمیں زندگی سے محبت کر

سکھاتی ہے اور اس تبت کو ایک فضیلت اور اسکی خاطر جہاد کو ایک عبادت سمجھنے کا ولولہ دیتی ہے (۹)۔ فیض نے خود اپنی شاعری کے پیغام کے سلسلے میں کہا۔" نہایت سادگی اور انکساری سے پیغام تو وہی ہے ۔جو سفر کے اندر ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ دنیا میں جتنا دکھ کم ہوسکے اچھا ہے۔ ہمیں انسانوں کی خوشیوں میں اضافہ کرنا چاہیئے ۔یہی میری شاعری کا پیغام ہے " فیض اور ترقی پسند تحریک یقیناً دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ فیض کی وابستگی اس تحریک کے ساتھ اتنی مکمل اور بھرپور تھی کہ ایک کی کہانی دوسرے کا افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ فیض نے اپنے قلم سے تحریک کو نوازا تو تحریک نے انہیں راستے کا عرفان بخشا۔

اقتباسات

(۱) وصی احمد سندیلوی، شاعر فیض احمد فیض، صفحہ ۱۵۔

(۲) فیض احمد فیض۔ المیزان اقتباس تنقیدی نظریات، صفحہ ۱۷۸،

(۳) ڈاکٹر سروجنی یکانی۔ ہائی لائٹس آف فریڈم مومنٹ ان آندھرا، صفحہ ۱۴۔

(۴) خلیل الرحمن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، صفحہ ۷۔

(۵) خلیل الرحمن اعظمی۔ صفحہ ۴۳۔

(۶) فیض احمد فیض۔ اقتباس تنقیدی نظریات، صفحہ ۱۸۳۔

(۷) اقتباس تنقیدی نظریات، صفحہ ۱۸۶۔

(۸) وصی احمد سندیلوی۔ صفحہ ۴۴۔

(۹) وصی احمد سندیلوی۔ صفحہ ۲۵۔

دور آصفجاہ ششم میر محبوب علی خان بہادر پر لنٹر کی کتاب کا تنقیدی جائزہ

آصفجاہی سلطنت کے چھٹے حکمراں میر محبوب علی خان آصف جاہ ششم پر R. Lynton اور Mohini Rajan کی کتاب Days of the beloved کا مقبول ہے۔ لیکن اس کتاب کا اب تک کسی نے تنقیدی جائزہ نہیں لیا ہے۔ اس لئے میں تنقیدی جائزے کے لئے اسے منتخب کیا ہے۔

تاریخ کی کسی کتاب پر تنقید اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے اسلئے کہ سائنس کے دوسرے مضامین کے برخلاف تاریخ کے حدود نہ متعین ہیں نہ کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح کٹھن مسئلہ تاریخ کے ماخذ ہیں۔ آثار، عمارتیں، کتبے، کتابیں، فرامین، خطوط اخبار اور نہ جانے کتنے ہی ایسے ذرائع ہیں جنھیں تاریخ کا ماخذ بنایا جاتا ہے۔ یہاں مختلف ماخذوں کے سہارے لکھی ہوئی تاریخیں ظاہر ہے اپنے طرز اور اپنے انداز میں ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوتی ہیں کہ ان پر تنقید اور تجزیئے کے یکساں اصول کارآمد نہیں ہوتے۔ پھر اختلاف رائے کے طوفان اٹھتے ہیں جو تاریخ کے ساتھ ہر دور میں مربوط رہے ہیں۔ ان ان گنت اور الجھے ہوئے مسائل کے درمیان گھرا ہوا تاریخ کا طالب علم الجھی ہوئی راہوں کا مسافر ہوتا ہے جو ہر کتاب کے ساتھ ایک نیا راستہ اختیار کرتا اور منزل کی تلاش میں راہوں کی خاک چھانتا رہتا ہے۔ اسلئے کسی بھی ایسی کتاب پر جو تاریخ ہو یا جس پر تاریخ ہونے کا اطلاق ہوتا ہو کسی کا تبصرہ بھی حرف آخر نہیں ہوتا "DAYS OF MY BELOVED" محبوب علی پاشاہ آصفجاہ ششم (۱۸۶۹ء - ۱۹۱۱ء) کی شخصیت اور انکے دور کے سماجی اور تمدنی حالات کو اجاگر کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔

مجھے اس کتاب کو اس دور کی صحیح اور مکمل تاریخ مان لینے میں پس و پیش ہے۔ پہلی

وجہ تو یہ ہے کہ کتاب کا بڑا حصہ کچھ گنے چنے افراد کی یادداشت پر بھروسہ کر کے لکھا گیا ہے۔ ان افراد کی فہرست کے دو نمایاں نام نواب غازی جنگ بہادر اور رائے محبوب نارائن صاحب کے ہیں۔ جنہیں مصنفین نے خود ہی نمایاں کیا ہے۔ کتاب کا وہ حصہ جو دربار آصفی اور انگریزوں کی کشمکش اور سیاسی حالات کا تجزیہ ہے انڈیا آفس ریکارڈ لندن سے لیا گیا ہے۔

ظاہر ہے یہ دونوں ماخذ کسی کتاب کے AUTHENTIC HISTORY بننے کیلئے یقیناً کافی نہیں ہیں۔ حیدرآباد کی تہذیب روایات پر اساس تھی۔ روایات کے درمیان وفاداری شرط اول مانی جاتی تھی۔ قطب شاہی دور سے آصفجاہی دور تک سرزمین حیدرآباد پر حکومت کرنیوالے خود مختار حکمرانوں کی طرف عام طور پر عوام اور خاص طور پر طبقۂ امراء کا رجحان (DIVINE RIGHT OF KING SHIP) کے دائرے میں محیط تھا۔ اس دائرے میں حرکت کرنے والے افراد کی زندگی ان روایات کی لکیروں پر اساس ہوتی تھی جو ان کے ذہنوں پر صدیوں کی کد و کاوش کے بعد بنائی گئی تھیں۔ روایات کا یہ سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزوں کے اقتدار نے ان روایات پر کاری ضرب لگائی لیکن پھر بھی صدیوں میں بنائے گئے ذہن برسوں میں نہیں بدلے جاسکے۔

اب اگر کسی دور کے حالات اور بادشاہ کی تاریخ لکھنے کے لئے ان افراد کی فہرست میں سے گنے چنے چند ایسے افراد چن لئے جائیں جنکی زندگی روایت پسندی سے عبارت تھی تو کتاب میں بیان کئے گئے واقعات شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہوتے۔

ہندوستان پر مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کے باب اول سے آخری باب تک جو حقیقت مستقل رہی وہ امراء کے درمیان کشمکش ہے۔ یہ کشمکش سیاسی بھی ہوتی تھی اور سماجی بھی۔ دور وسطی کے آغاز سے اختتام تک امیر کا اطلاق دولت پر نہیں بلکہ عزت اور خاندانی وجاہت کے معیار پر کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ امراء کا ہر خاندان اپنے کو دوسرے خاندانوں سے افضل ثابت کرنے کی کم از کم کوشش ضرور کرتا تھا۔ آپ کو حیدرآباد میں کچھ بزرگ ایسے مل جائیں گے جو دور ماضی کے واقعات کو اس انداز سے سنائیں گے کہ آپ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے

کہ انکے خاندان کے علاوہ کل کے حیدر آباد میں امراء کے سارے خاندان ہیچ تھے ۔
کے واقعات کو انٹرویو کے اساس پر لکھنے سے پہلے احتیاط ضروری ہے ۔ انٹرویو کے
خاندانوں سے افراد منتخب کئے جانے چاہیں اور پھر انکے بیان کئے ہوئے واقعات
مطالعہ کے بعد حقیقت کو مبالغہ سے علحدہ کیا جانا چاہیئے ورنہ کتاب سماج کے ایک
صرف ایک محدود گروہ کی ترجمان ہوجائے گی LYNTON نے اپنی کتاب کو مرتب
ہوئے اس اصول کو پیش نظر نہیں رکھا ہے ۔

کتاب کا دوسرا ماخذ بھی یقیناً مکمل بھروسہ کے قابل نہیں ہے ۔ انڈیا آفس
انگریز افسروں کے درمیان خط و کتابت ، ریذیڈنسٹ کی رپورٹوں اور دفتری
مشتمل ہے ۔ ظاہر ہے کہ انکو ماخذ بنا کر جو حالات لکھے جائیں گے ان میں صرف انگریز
نظر منعکس ہوگا ۔ کیا یہ جانا چاہیئے تھا کہ آصفی دور اور انگریزوں کی سیاسی کشمکش سے
دیسی ریاستوں میں محفوظ ماخذوں کی مدد سے لکھے جاتے اور احتیاط کے تقاضوں کو پو
کیلئے انہیں انڈیا آفس کے ریکارڈ سے چیک کر لیا جاتا ۔

کسی بادشاہ یا کسی شخصیت پر لکھنے کے عموماً دو طریقے ہوتے ہیں ۔ پہلا یہ
بادشاہ کے مرتبے اور اسکے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ اس بادشاہ کے مکمل حالات معلو
اور انکا تجزیہ کرنے کے بعد کیا جائے ۔ دوسری طریقہ یہ ہیکہ پہلے ہی سے یہ فرض کر لیا جا
بادشاہ عظیم المرتبہ انسان دوست اور انسان کامل تھا اب اپنے مفروضے کو ثابت کر
لئے اسکی زندگی کے ان واقعات کو چن لیا جائے جو مفروضہ کو پایہ ثبوت تک پہنچ
معاون ثابت ہوتے ہیں ۔ اگر آپ کو اس طریقہ فکر کا اندازہ کرنا ہو تو مختلف کتابوں
کی مذہبی پالیسی کے متعلق پڑھئے ڈاکٹر ترپاٹھی نے اپنی کتاب AND FALL OF
THE MOUGHAL EMPIRE میں اکبر کو ایک سچا مسلمان ثابت کیا ہے ۔

ڈاکٹر سری واستوا کی کوششیں بھی اسی مفروضہ کے تحت ہیں لیکن ونسنٹ ا
اپنی کتاب میں یہ ثابت کر دکھایا کہ اکبر مسلمان باقی نہ رہا تھا ۔ اس انداز فکر کا دوسر

ہے جسمیں مصنف پہلے ہی سے یہ مفروضہ قائم کرلیتا ہے کہ وہ جس بادشاہ کے بارے میں لکھ رہا ہے وہ ظالم، فاترالعقل اور انسانیت دشمن تھا۔ برنی نے محمد بن تغلق کی شخصیت پر اسی منفی رجحان کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کیلئے اپنی کتاب لکھی تھی۔ یہ الگ بحث ہے کہ یہ طریقہ صحت مند ہے یا نہیں۔ لیکن یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ہوا ہے۔

LYNTON کی کتاب کا مطالعہ قاری کو کتاب کے آغاز سے اختتام تک اسی الجھن میں گرفتار رکھتا ہے کہ کبھی کبھی تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ واقعات کے تجزیئے سے پہلے ہی نتیجہ اخذ کرلیا گیا تھا اور اپنے مفروضہ کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کے لئے بادشاہ کی زندگی سے ان واقعات کو چن لیا گیا جو مفروضہ کو پایہ ثبوت تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ کتاب کئی صورتوں سے لائق مطالعہ بھی ہے اور قابل تحسین بھی۔

یورپ کے دور نشاۃ ثانیہ نے سب سے پہلے علم کے دھاروں کو چرچ کی زنجیروں سے چھڑا کر انسانی مسائل کے راستہ پر گامزن کیا۔ انسانی شعور کی بیداری اور فکر کی روشنی نے یورپ میں انقلابوں کو جنم دیا۔ ان انقلابوں کے نتیجے میں دنیا کے مختلف حصوں سے بادشاہت ختم ہوتی گئی اور جمہوریت نے اپنا سکہ جمایا۔ ان حالات کا تاریخ پر گہرا اثر پڑا۔

اب تاریخ دانوں کے لئے بادشاہ اور مملکت کی توسیع کے لئے لڑی جانے والی جنگیں اہم نہ رہیں۔ انکی فکر انسانی مسائل پر مرکوز ہوئی لیکن تاریخ کے ان ماخذوں سے جو ایک طرح سے منجمد ہیں فکر کی اس انقلابی تبدیلی کیلئے مواد ڈھونڈ نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس بے سرو سامانی کے عالم میں جو کتابیں سہارا بنتی ہیں یہ ان ہی میں سے ایک کتاب ہے۔ آپ کتاب کو جوں جوں پڑھتے جایں گے آپکے سامنے حیدرآباد کے سماجی حالات، سماج کی درجہ بندی اور انکا طرز زندگی روشن ہوتا جائیگا۔ کتاب میں جن اشخاص کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ یقیناً حیدرآبادی اسماج کے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جنکے سہارے حیدرآبادی سماج کی واضح تصویر بنائی جا سکتی ہے۔

آصفیہ خاندان کے حکمران خود مختار تھے اور دوسرے حکمرانوں کے مقابل ان کی

عظمت یہ تھی کہ انکی اپنی ریاست میں رہنے بسنے والے امراء اور عوام دونوں کے دلوں میں پیار اور ان کی عظمتوں کی حفاظت موجزن تھی ۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزوں کے بڑھتے ہو۔ اقتدار نے دیسی حکومتوں کے امراء کی نگاہوں کو حکمرانوں سے ہٹا کر اپنی طرف مرکوز کر لیا دیسی ریاستوں کی سیاست میں واضح انقلاب ان ریاستوں کے UBSIDIARY ALLIANCE) کے مان لینے کے بعد شروع ہوا۔ ریذیڈنٹ کی آمد نے ریاست میں حکمرانو کے مقابل ایک اور ہستی کو لا کھڑا کیا جسکے اشارے پر دیسی ریاستوں میں سے اکثر کے حکمرا رقصاں تھے ۔ لیکن حیدرآباد ان ریاستوں کے درمیان اس انداز میں مختلف تھا کہ اس ریاست کے حکمرانوں نے انگریزوں کے اقتدار کو اپنی حدوں سے کبھی بڑھنے نہ دیا۔ آصفجاہ ثا سے سابع تک حکمرانوں اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی سیاسی کشمکش کے اظہار کے لے یک مکمل کتاب چاہیے ۔ ڈاکٹر سروجنی ریگانی پروفیسر شعبہ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی کی کتاب THE BRITISH AND THE NIZAMS RELATIONS اس عنوان پر بڑی جامعہ کتاب ہے لیکن LYNTON کی کتاب کے چند ایک واقعات اس کشمکش پر ستے اندا میں روشنی ڈلتے ہیں ۔ مثلاً دیوان کے عہدے پر تقرر کے سلسلے میں میر محبوب علی پاشاہ او ریذیڈنٹ میں ہونیوالی کشمکش کا حال یا انگلش ٹیوٹر کے تقرر کے سلسلے میں میر محبوب علی پاشاہ کا اپنے اصول پر اڑے رہنا وغیرہ ۔

خاندان آصفی کے حکمرانوں کی انسان دوستی اور اپنی رعایا سے انکی محبت انھیں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی تاریخ میں ممتاز کرتی ہے ۔

LYNTON کی کتاب بڑے واضح انداز میں چھوٹے چھوٹے واقعات کے سہارے میر محبوب علی پاشاہ کی انسان دوستی اور ان کے رعایا سے پیار و محبت کے برتاو کو اجاگر کرتی ہے ۔ چارمینار کی بلندی سے شہر کا جائزہ مکمل بھی ہے اور خوبصورت بھی ۔

تین سال کے کم سن پاشاہ کی تعلیم و تربیت کی تفصیل کتاب کا بڑا کارآمد حصہ ہے ۔ مشرقی اور مغربی تعلیم کا امتزاج اس دور کا خاصہ تھا۔ سر سالار جنگ اور claudeclerk کی

نگرانی میں تعلیم کا جو انداز اپنایا گیا اس سے حیدرآبادی امراء کی وفاداری اور انکے تہذیبی اقدار کا بڑا اچھا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے کے چھوٹے چھوٹے واقعات جو کتاب میں بڑے سلیقے سے لکھے گئے ہیں۔ قاری کو اس بدلتے ہوئے دور کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ میں کتاب میں لکھے گئے کسی واقعہ کو نقل کرنے سے احتراز کر رہا ہوں کہ اس سے مضمون طویل ہوجائیگا اور کتاب کے ہوتے ہوئے اس اعادہ کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے لیکن اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کیلئے کتاب کے صفحہ (۲۳) پر لکھے گئے واقعہ کی طرف اشارہ ضرور کروں گا۔ دس برس کے کمسن حکمران نے جب گوشت کو علحدہ کرنے کے لئے چمچہ کو چھوڑ کر ہاتھ کا استعمال کیا تو سرسالار جنگ نے بادشاہ وقت کو اس انداز سے غلطی کا احساس دلایا کہ پانچ اشرفیوں کی نذر پیش کی اور یہ کہا کہ غلطی اس خادم کی تھی کہ اس نے حضور کو چمچے کا استعمال نہیں بتلایا تھا۔

حیدرآبادی امراء کا یہ انداز اس دور کے تاریخی پس منظر میں قابل قدر ہے۔ ہندوستان کی دور وسطی کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ امراء اور حکمرانوں کے درمیان قریب قریب ہر دور میں اقتدار کے حصول کیلئے کشمکش ہوتی رہی بلکہ دور وسطی کے اکثر مسلمان حکمرانوں کے لئے امراء کو قابو میں رکھنا ایک مشکل مسئلہ بن گیا تھا۔ انہیں اپنے امراء کے مرتبہ کو گھٹانے کے لئے خاص اصلاحات کرنی پڑیں۔ سلطان بلبن، علاالدین خلجی اور جہانگیر کے دور اس کشمکش کی زیادہ واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ اسکے برخلاف حیدرآبادی امراء کا رویہ حکمراں سلطنت کی طرف ہمیشہ وفاداری کا رہا LYNTON نے اپنی کتاب میں ان واقعات کو بڑی احتیاط کے ساتھ جمع کیا ہے کتاب کے صفحہ ۸۳ پر میجر ولی الدولہ بہادر کا واقعہ مختصر سے لفظوں میں یوں ہے " میجر ولی الدولہ پائیگاہ کے ایک امیر کے فرزند دیوان حیدرآباد کے چشم و چراغ الیسٹن سنیڈرس اور امپیریل کالج کے طالب علم ڈیرادون ملٹری کالج کے ٹرینڈ نوجوان تھے جنہیں کنگس کمیشن ملا تھا انکی شخصیت میں مغرب و مشرق کا بڑا خوبصورت امتزاج تھا LYNTON نے لکھا ہے۔

The youth initiation in the western was delibarate and through but he

was still respected to be a noble of the Oriental Court:

حیدرآبادی روایات کی حفاظت کے جذبہ نے جو ولی الدولہ کے رگ وپئے میں پیوست تھا۔ انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ کنگ جارج کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے حکمراں کو بالکل اسی انداز میں سلامی دی۔ اگرچہ کہ اسکے نتیجہ میں انہیں کمیشن سے ہاتھ دھونا پڑا۔ دور آصفی میں حیدرآبادی سماج دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک امراء اور دوسرے خدمتگزار، اوسط طبقہ اگرچہ آصفی دور کے تقریباً وسط سے قابل لحاظ ہو گیا تھا لیکن پھر بھی سماج کا مزاج نہیں بدل سکا تھا۔ سماج کی ایسی تقسیم دنیا کے جس ملک میں بھی رہی ہے وہاں تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں انقلاب ضرور آیا ہے۔ عوام نے امراء کے خلاف صفیں آراستہ کیں لیکن حیدرآباد کی تاریخ کم از کم آصفجاہ ہفتم کے دور کے ابتدائی حصے تک اس قسم کے انقلاب سے یکسر خالی ہے اس کی وجہہ اس کتاب کے مطالعہ سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ حیدرآباد کے حکمرانوں اور امراء کی مثال ان سایہ دار درختوں کی سی تھی جن کے سائے میں عوام اطمینان اور سکون کے زندگی گزارتے تھے۔ ایک عام آدمی کی زندگی بنیادی طور پر تین چیزوں سے عبارت ہوتی ہے۔ غذا، کپڑا اور اپنے مستقبل کے متعلق اطمینان۔ اگر یہ تینوں چیزیں میسر آجائیے تو عوام خوشحال بھی رہتے ہیں اور مطمئن بھی۔ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیں وہ بادشاہ کا تذکرہ ہو کہ کسی امیر کا تذکرہ ہو آپکو یہ ضرور ملے گا کہ وہ خدمتگاروں کے ایک بہت بڑے گروہ کی زندگی کی تینوں بنیادی چیزوں کا ذمہ دار رہا ہے۔ کتاب کے صفحہ (۱۸) پر محبوب علی پاشاہ کا ایک بے سہارا شخص سے کہنا۔

How can you say you are homeless when your slave has houses that are open and awaiting (P-92)

یا سر وقار الامراء کے ملازم منیم خان کے ایک ماہ کی پیشگی تنخواہ طلب کرنے پر انکا اپنے سکریٹری سے کہنا۔

Secretary, his salary is his not mine

مہاراجہ کشن پرشاد کی سخاوت کے سلسلے میں یہ اصول

Do not despise any one you never
Konw it may be God himself who
Visits you in the guise of a Begger

سر فخرالملک بہادر کا اپنے خدمتگاروں کی بیماری، شادی بیاہ کی ساری ذمہ داری قبول کرنا ایسی باتیں ہیں جنھیں مصنفین نے کتاب میں یکجا کر کے حیدرآباد کی تاریخ کے طالبعلم کو حیدرآباد کی سرزمین پر سماج کی طبقوں میں تقسیم کے باوجود انقلاب کے نہ آنے کی وجہہ سمجھائی ہے۔

کتاب کل بارہ ابواب پر مشتمل ہے ان مین سے دو ابواب میں محبوب علی پاشاہ یاان کی شخصیت اور ان کے امراء اور عوام سے برتاؤ کو چھوٹے چھوٹے واقعات کے سہارے اجاگر کیا گیا ہے لیکن محبوب علی پاشاہ کے اپنی مملکت کی ترقی اور عوام کی بھلائی کے لئے کئے گئے اصلاحات کا ذکر واضح طور پر کہیں نہیں ہے۔ کسی بھی حکمران لیڈر یا رہنما کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کی اپنی شخصی زندگی اور دوسری اس کی عوامی زندگی۔ شخصیت کے صرف یک رخی جائزہ سے شخصیت کا جائزہ مکمل نہیں ہوتا۔

کتاب کے چار ابواب امراء پائیگاہ، مہاراجہ کشن پرشاد، فخرالملک اور بیگم فخرالملک کی شخصی اور مجلسی زندگی کے خاکے ہیں اور بڑی محنت کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

ان ابواب کے مطالعہ سے آصفجاہی تاریخ کی اس مثلثی کشمکش کا خاکہ بنتا ہے جس میں انگریز حکمران اور امراء اپنا اپنا کردار کر رہے تھے۔

حیدرآبادی امراء کی اپنے حکمران سے وفاداری انگریزوں کی تمام تر کوششوں کے با بھی مستقل رہی۔ مثلاً شہاب جنگ بہادر کا ملکہ وکٹوریہ کے سوگ میں سیاہ لباس پہننے سے انکار کا واقعہ قاری کے ذہن پر ان امراء کی عظمتوں کا بڑا گہرا نقش چھوڑتا ہے لیکن یہ بات ذہن میں کھٹکتی ہے کہ اگر کم از کم ایک باب میں مختصر ہی سہی امراء کے دوسرے خاندانوں کا تذکرہ

بھی کیا جاتا تو آصفجاہی امراء کی زیادہ واضح اور مکمل تصویر بن جاتی۔

کتاب کا آٹھواں باب سمستان کے راجاؤں کے تذکرے پر مشتمل ہے اور آ‍
خاندان کی مذہبی رواداری اور وسعت نظر کے ثبوت مہیا کرتا ہے۔

باقی تین ابواب میں سے دو باب متوسط طبقے کی زندگی کو اجاگر کرنے کیلئے اس ط‍
عورت رکمنی کے انٹرویو اور نچلے طبقے کے تین افراد کے انٹرویو پر مشتمل ہیں لیکن ان دو
ابواب کا قاری کے ذہن پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ اس دور کے متوسط طبقے اور مزدور ط‍
طرز زندگی ایسا واضح ہوتا ہے جیسا ہونا چاہیئے۔شائد انہیں اس لئے شامل کر دیا گیا ہو کہ ک‍
سماج کے ہر طبقے کی سماجی زندگی کی عکاسی کرے۔کتاب میں کہیں کہیں معمولی غلطیاں
ہیں مثلاً صفحہ (۱۲) پر چارمینار کی تعمیر کی وجہ یہ بیان کی گئی۔

The young prince married his lover and built Charminar to commerate
: spot where he had first seen her.

ڈاکٹر ہارون خاں شیروانی نے اپنی معرکتہ الاراء کتاب STORY OF THE
QUTUB SHAHI DYNASTY میں سیر حاصل بحث کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ بھاگ
متی کا وجود حقیقت نہیں افسانہ ہے۔

کتاب کے صفحہ (۲۳۱) پر کبڈی کے کھیل کو A kind of Foot Ball لکھا
ہے جو سراسر غلط ہے لیکن ان چھوٹی چھوٹی غلطیوں کے باوجود جو کہیں کہیں ہو گئی ہیں کتاب
مجموعی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مجموعی طور پر Days of the Beloved محبوب علی پاشاہ آصفجاہ ششم
زندگی اور اس دور کے سماجی حالات پر لکھی گئی بڑی قابل قدر کتاب ہے۔اچھا ہوگا اگر ا‍
کتاب کا اردو میں ترجمہ کرکے شائع کیا جائے تاکہ آصفجاہی تاریخ کے ایسے طلباء کی تشفی ہو‍
جو انگریزی سے واقف نہیں ہیں۔

(ادبی اجلاس۔نظام اردو ٹرسٹ لائبریری

نصرتی کی مثنوی علی نامہ کی تاریخی اہمیت

شاعری اور تاریخ نویسی کا فرق بہتی ندی کے دو کناروں جیسا ہے۔قریب قریب ہوتے ہوئے اور ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی جو مستقل سے اور کبھی کبھی ہی ہم آغوش ہوتے ہیں تاریخ Facts کو لفظوں کا روپ دینے کا فن ہے اور شاعری لفظوں کے بطن سے احساس کو اجاگر کرنے کا نام تاریخ داں واقعہ کو اہمیت دیکر اسے دیانت داری کیساتھ کاغذ پر محفوظ کرتا ہے تو شاعر واقعہ سے زیادہ واقعہ کے اثرات پر توجہ دیتا ہے۔وہ یہ نہیں دیکھتا کہ واقعہ کیا ہوا۔اسکی توجہ کا مرکز اس واقعہ کا انسانی فکر و نظر اور انسانی جذبات پر ہونے والا اثر ہوتا ہے۔کسی جنگ کا احوال دیانتداری سے لکھ دینا تاریخ داں کا منصب بھی ہے اور شرف بھی، لیکن جنگ کے نتیجے میں سماج پر مرتب ہونے والے اثرات کا اظہار شاعر کا کام ہے۔تاریخ داں کے لئے لفظ لفظ ہوتا ہے۔علامت نہیں بننے پاتا، لیکن شاعر کے لئے لفظ لفظ کم اور علامت زیادہ ہوتا ہے۔اس لئے تاریخ کے طالب علم کو لفظوں کو کریدنے اور معنی کے تلاش کرنے کی چنداں ضرورت پیش نہیں آتی لیکن شاعر کے پڑھنے والے کو خار سے برگ گل کا سینہ چاک کرنے کی حاجت ہوتی ہے پھر شاعری مبالغے سے عبارت ہے اور تاریخ مبالغے سے مبرا۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ تاریخ داں کیلئے کسی دور کا ادب کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا ہو یا ادب کا طالب علم تاریخ کو فراموش کر کے راستہ پاسکتا ہو۔دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ تاریخ کا طالب علم ادب کو کانٹ چھانٹ کر اسے تاریخ میں بدل دیتا ہے۔وہ سارے اجزاء جو تاریخ کے احاطہ میں نہیں آتے اسے وہ کسی عضو معطل کیطرح ادب سے جدا کرتا جاتا ہے۔اسی طرح ادب کا طالب علم تاریخ کے اس حصہ کو اپناتا ہے جو کسی شاعر یا ادب پر اپنے اثرات مرتب کر سکتا ہو۔

تاریخ اور ادب کے اس باہمی ربط کے عنوان تلے کچھ ایسے بھی نام ملتے ہیں جن میں یہ دونوں اجزاء ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔

نصرتی اسی فہرست کے ایک شاعر کا نام ہے جس نے تاریخ کے لکھنے کیلئے شعر کے Medium کو پسند کیا۔

بد قسمتی سے نصرتی کے شخصی حالات کا بہت کم علم ہوا ہے حتی کہ یہ بھی صحیح طرح سے معلوم نہ ہو سکا کہ اسکا نام کیا تھا۔ عبد الجبار خان ملکاپوری نے تذکرہ شعراء دکن میں اسکا نام محمد نصرت بتایا ہے لیکن اردو کے صاحبان فکر و نظر کو یہ نام تسلیم کرنے میں پس و پیش ہے نصرتی کی تاریخ پیدائش بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے نصرتی کی تاریخ پیدائش اسی کے ایک مصرعہ تاریخ سے اخذ کر کے ۱۵۷۴ء لکھی ہے۔ نصرتی نے خود ہی اپنی مثنویوں میں اپنے خاندان اور اپنی تعلیم کا ذکر کیا ہے، اس لئے اس باب میں اسکالرس کا قلم رواں ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اسکے اجداد صاحبان سیف رہے ہیں۔ صاحبان قلم نہیں۔ غالب کی طرح نصرتی کو بھی پیشہ آبا سپہ گری ہونے پر فخر ہے۔ نصرتی بچپن سے ذہین تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اسے اس دور کے صاحبان قلم و صاحبان فکر و نظر کے آگے زانو ادب تہہ کرنے کا موقع ملا۔ فنکاروں کے ہاتھوں نے تراشا تو ہیرے نے وہ رنگ روپ نکالا کہ روشن نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ نصرتی نے برسوں کا سفر مہینوں میں اور مہینوں کا سفر دنوں میں طے کیا۔ علی عادل شاہ ثانی کے بادشاہ ہوتے ہوتے نصرتی ادب کی مملکت پر حکمراں ہو چکا تھا۔ علی عادل شاہ نے اپنے بچپن کے ساتھی نصرتی کو اپنے دربار کا ملک الشعراء بنا کر اسے اپنا لیا۔

نصرتی نے کل تین مثنویاں لکھیں۔ علی نامہ، گلشن عشق اور تاریخ اسکندری۔ لیکن نصرتی کی پہلی دو مثنویاں اسکی فکر کا حاصل بن گئیں۔

"علی نامہ" کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ ڈاکٹر عبد المجید صدیقی نے اسے ایک ادبی شاہکار تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر عبد الحق کی رائے بھی ڈاکٹر صدیقی کے خیال سے مطابقت رکھتی ہے، لیکن علی نامے کی اہمیت ایک ادبی شہ پارے کے علاوہ اس دور کے ایک اہم تاریخی ماخذ کی حیثیت سے بھی مسلم ہے۔

"علی نامہ" ایک مکمل مثنوی ہے۔ جس میں مثنوی کے سارے آداب کا لحاظ رکھا گیا

ہے۔ حمد سے شروع ہوتی ہے۔ نعت میں معراج کو منظوم کیا گیا ہے۔ پھر حضرت علیؓ کی شان میں مدح کے شعر ہیں مدح کا خاتمہ خواجہ بندہ نوازؒ کی مدح میں لکھے گئے چند اشعار پر ہوتا ہے لیکن علی نامے کا اہم حصہ وہ ہے جہاں نصرتی نے علی عادل شاہ کے دور حکومت کے ۱۹ سالوں کی تاریخ منظوم کی ہے۔ وہ ایک تاریخ داں تھا۔ علی نامے میں واقعات کی ترتیب اتنے صحیح ڈھنگ سے کی گئی ہے کہ اسے اس دور کی کسی بھی خاص تاریخ پر منطبق کیا جائے تو لفظ لفظ اور واقعہ واقعہ منطبق ہوگی یہی نہیں بلکہ ہر واقعہ کا آغاز مصرعہ تاریخ سے ہوتا ہے جس سے تاریخ کے طالب علم کو اس واقعہ کے صحیح صحیح سنہ کا علم ہوجاتا ہے۔ "علی نامہ" جن تاریخی واقعات کو اپنے میں سموئے ہوئے ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) علی عادل شاہ کی تخت نشینی اور اس دور کے سیاسی حالات۔(۲) پنالا کی فتح (۳) ملتد پر حملہ (۴) جوہر کی بغاوت (۵) شائستہ خاں کی شکست (۶) سورت پر شیولجی کا حملہ (۷) جے سنگھ اور علی عادل شاہ کا معاہدہ (۸) خواص خان کی شیولجی پر فتح (۹) شیولجی اور جے سنگھ کی لڑائی (۱۰) جے سنگھ کا بیجاپور پر حملہ (۱۱) بیجاپور اور مغل افواج کی جنگ۔

"علی نامہ" کا سب سے اہم حصہ شیولجی سے متعلق ہے جسے توجہ سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے، اور تاریخ کا یہی حصہ آج دکن کی تاریخ کے طالب علموں کے درمیان موضوع بحث بھی ہے۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے میں دوسرے حصوں پر گفتگو کو ترک کر رہا ہوں اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ حصے دوسری تاریخوں سے بھی دستیاب ہوجاتے ہیں۔ لیکن نصرتی کی مثنوی میں شیولجی پر نصرتی کے لکھے ہوئے اشعار پر غور کیا جائے تو تاریخ کے بعض مشکل سوالوں کا حل نکل آتا ہے۔ نصرتی کا لہجہ شیولجی کے سلسلے میں ابتدائی اشعار میں قابل اعتراض حد تک بگڑا ہوا ہے۔ وہ شیولجی پر لعن طعن کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ اسکا لہجہ مغلوں کیطرف ہمدردانہ ہے لیکن جب مثنوی جے سنگھ کے بیجاپور پر حملہ تک پہنچتی ہے تو نصرتی کی مثنوی کا مزاج یک لخت مخالف سمت میں پلٹتا ملتا ہے۔ اب اسے مغلوں سے ہمدردی نہیں ہے

نصرتی کا یہ انداز تاریخ دانوں کے دو ایک سوالوں کا جواب ہے۔ اسکالرس کے ایک

بڑے گروہ کا خیال یہ ہے کہ دکن کی دونوں ریاستوں بیجاپور اور گولکنڈہ کی ہمدردیاں
کے خلاف مغلوں کیساتھ اسلئے تھیں کہ شیولجی ہندو مذہب کا پیرو تھا۔ لیکن " علی
مطالعہ اس خیال کو رد کرتا ہے اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمدردی کا یہ جذبہ
بنیاد پر نہیں تھا بلکہ اسلئے تھا کہ مرہٹوں کی ریاست کی بنیاد ہی عادل شاہی اور قطب
حکومتوں سے لوٹے گئے علاقوں پر پڑی تھی۔ لیکن جب دکن کی ریاستوں کو مغل سلطنت کی
توسیع پسند پالیسی کا یقین ہوا اور دور اورنگ زیب میں انہیں اپنے وجود کو بچانے کی
ہوئی تو یہی ریاستیں مغلوں کے خلاف مرہٹوں سے ہمدردی جتانے پر مجبور ہوئیں۔
اپنی مثنوی میں بدلتا لہجہ اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔ نصرتی علی عادل شاہ کو دوست
فطرتاً شاعر تھا حساس طبیعت اور بیدار فکر کا مالک تھا۔ اسکی شاعری کا لب و لہجہ اسکے
جذبات کا غماز ہے جنکا سبب اس دور کے سیاسی حالات تھے۔

" علی نامہ " کو رزم نامہ کہنا بجا ہے۔ نصرتی نے کئی جنگوں کی تفصیل کئی سو اشعار
پیش کی ہے کبھی کبھی تو یہ کھلنے لگتی ہے لیکن ساتھ ساتھ علی نامے کی چند اپنی خصوصیات
نصرتی نے اپنے مثنوی میں تفصیل سے فوجی تیاریوں، فوج کی ترتیب و تشکیل
میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں اور War Craft پر روشنی ڈالی ہے جو تاریخ
کسی کتاب میں دستیاب نہیں ہیں۔

نصرتی کی مثنوی " علی نامہ " کی دوسری عطا شاعر کے سماجی شعور سے عبارت ہے
وسطی کے تقریباً سب ہی تاریخ دانوں کیلئے تاریخ ایک اسٹیج کے ڈرامے جیسی تھی۔
وقت عالم پناہ اس ڈرامے کے مرکزی کردار اور انکے امراء و سردار اسکے کردار ہوتے
تاریخ داں اسی ڈرامے کو دلچسپی سے دیکھتا اور ایمانداری سے کاغذ پر محفوظ کر دیتا تھا۔
کسی تاریخ داں نے پلٹ کر عوام کیطرف دیکھنے یا ان تقریبات کو لکھنے کی زحمت گوارہ
جس سے اس حصہ کے سماجی حالات کا علم ہوسکے۔ علی نامہ میں نصرتی نے محرم، سورت
کے حملہ سے قبل اور بعد وغیرہ کو تفصیل سے بیان کر کے آج کے طالب علم کیلئے کارآمد

مہیا کیا ہے۔

نصرتی نے طویل عمر پائی۔عادل شاہی خاندان کے تین ادوار اس نے دیکھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ وہ طویل عرصے تک حکومت عادل شاہی کے اس طبقے کا معزز رکن رہا جسکی گودی میں مملکت کی سیاست پلتی اور بڑھتی رہی۔ اسلئے نصرتی کا علم سماعی نہیں تھا۔ اسنے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے مشاہدے کے بل بوتے پر لکھا ہے۔

"علی نامہ" کی ایک دین اس دور کے نامور امراء کے حالات کی تفصیل ہے نصرتی مردم شناس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیا، کیوں، کسی کو قدآور کر دیتا ہے اس نے مختلف امراء سے نہ صرف اپنے پڑھنے والوں کو متعارف کرایا ہے بلکہ عادل شاہی دربار میں ہر امیر اور صاحب فکر کے مقام کو بھی واضح کیا ہے۔

علی نامے کی ان تمام خوبیوں کے باوجود بھی علی نامہ کو من و عن تاریخ مان لینا صحیح نہیں ہے۔

اس میں وہ تمام اجزاء موجود ہیں جو شاعری کا لوازمہ ہوتے ہیں۔ اکثر مقامات پر مبالغہ نے رائی کو پربت کی شکل دیدی ہے۔ نصرتی کی علی عادل شاہ سے دوستی اور دربار سے وابستگی نے اسکے اپنے ASSESEMENT کو متاثر کیا ہے۔ اس کی اپنی رائے بادشاہ وقت کی مرضی پر موقوف نظر آتی ہے۔ علی کا دوست اسکا دوست، علی کا دشمن اسکا دشمن تھا۔ اس جذبے نے بعض مقامات پر نصرتی کے بیان کو قابل رد بنادیا ہے مثلاً جے سنگھ اور علی عادل شاہ میں شیواجی کے خلاف معاہدے کو نصرتی نے یوں بیان کیا ہے کہ علی عادل شاہ مغل شہنشاہ سے زیادہ عالی مرتبت لگتا ہے۔ کہیں کہیں تو نصرتی نے حقائق کو چھپایا بھی ہے تاکہ بادشاہ کی کمزوریوں کو نظرانداز کیا جاسکے۔

لیکن پھر بھی مجموعی اعتبار سے "علی نامہ" تاریخ بیجاپور کا ایک اہم ماخذ ہے اور چونکہ یہ ایک شاعر کی تخلیق ہے اسلئے اسکی اہمیت منفرد ہے۔

اردو مجلس

۲۲۔ فبروری ۱۹۸۱ء

یہ لکھکر کی ہے کہ قطب شاہی نظم و نسق میں مکمل مذہبی آزادی تھی۔ہندوؤں اور مسلمان
دونوں کو اس بات کے مواقع حاصل تھے کہ وہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں تک ترقی کریں۔
قطب شاہی حکمرانوں میں ابراہیم قطب شاہ کے تعلقات ہندو رعایا سے بہت ہی گہر
تھے۔ہندو ابراہیم کو اس حد تک چاہتے تھے کہ اسے بھگوان کا درجہ دے دیا تھا۔قطب شہ
دور کے تلگو ادب میں سب سے زیادہ نظمیں ابراہیم قطب شاہ کی تعریف میں ہی ملتی ہیں۔
دور کے ایک شاعر ادنکی گنگادھر نے ابراہیم کی خواہش پر مہابھارت کے قصوں کو منظوم کیا
اس نے اس کام کے کرنے کی جو وجہ بتائی ہے وہ ابراہیم کے ہندوؤں سے تعلقات کی نشاندہ
کرتی ہے۔وہ لکھتا ہے کہ جب اسنے شعر کہنے کا ارادہ کیا تو ابرہیم نے اسے طلب کیا تاپتا کی کہ
کو ویسے ہی نظم کرنے کی خواہش کی جیسے وہ مہابھارت میں لکھی گئی ہے۔وہ کہتا ہے کہ ابرا
نے جب اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ مہابھارت کے قصے سننے میں مگن تھا۔شاعر کا یہ بیان
طرف اشارہ کرتا ہے کہ ابراہیم کے دربار میں نہ صرف مسلم علماء کی سرپرستی کی جاتی تھی
غیر مسلم پنڈتوں کی بھی دل کھول کر سرپرستی ہوتی تھی۔دونوں کو دربار میں ایک ساتھ ا
بیٹھنے اور اپنی تخلیقات کو پیش کرنے کے پورے مواقع حاصل تھے۔اگر شاعر کو سماج
جذبات کا ترجمان سمجھا جاتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ابرہیم کی رواداری نے ہندو سماج
جذبات کو اس قدر اپنا لیا تھا کہ شعراء نے اسے اوتار کا درجہ دے دیا۔یہ صحیح ہے کہ مبا
شاعری کا جز ہے لیکن ابراہیم کی شان میں لکھی ہوئی ان نظموں کو مبالغہ تسلیم بھی کر لیا جائے
یہ بات پھر بھی ماننی پڑے گی کہ شعراء کو اس سے اتنی محبت تھی کہ انہوں نے اسکی مدحت
باب میں مبالغہ کو بھی جائز سمجھا۔ڈاکٹر واسو متی نے اپنی کتاب دور قطب شاہی کا تلگو ادب
ایسی بہت ساری نظموں کو اکٹھا کیا ہے۔بعد کی تحقیق سے ان نظموں میں اور اضافہ ہوا۔
ظاہر ہے میں ایک مختصر سے مقالے میں وہ ساری نظمیں نہیں پیش کر سکتا لیکن اپنی بات
پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے صرف ایک نظم کا انگریزی سے اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں
ترجمہ ایک بند کا ہے۔یہ نظم بھٹا(BHATTA) اور شاعر کے درمیان مکالمے کی صورت م

ہے۔

بھٹا۔ یہاں آو

شاعر۔ تم مجھے کیوں بلاتے ہو

بھٹا۔ تمہیں براہیم شاہ سخی بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے جو مانگنے والے کو دل کھول کر عطا کرتا ہے۔

شاعر۔ کیا وہ ہزار دس ہزار بھی عطا کرتا ہے۔

بھٹا۔ کیا کہہ رہے ہو وہ جب دیتا ہے تو لاکھوں کروڑوں میں دیتا ہے۔

اسی دور کے ایک شاعر گنگادھر نے کچھ اور قدم آگے بڑھایا۔ اس نے ابرہیم کو رام کا روپ لکھا۔ اپنی شاعری میں جو مہابھارت کی ۲۵ کہانیوں پر مشتمل ہے اسنے لکھا ہے کہ رام نے براہم کے روپ میں ایک بار پھر کلیگ میں جنم لیا ہے۔ تاکہ برائیوں کا خاتمہ کردے اور اسے اچھائیوں سے بھر دے۔

عام طور پر مورخین کا یہ خیال ہے کہ ابراہیم کی تلگو ادب سے دلچسپی اور اسکی بھرپور سرپرستی کی وجہ بادشاہ بننے سے پہلے اسکے وجے نگر سلطنت میں قیام کا نتیجہ تھی۔ یہ ابراہیم کی تلگو شاعری سے رغبت کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے لیکن صرف یہی وجہ نہیں ہو سکتی اس لئے کہ تلگو شعراء کی سرپرستی سے ابراہیم کو نہ کوئی سیاسی فائدہ حاصل ہوا نہ اسکی سلطنت میں اس سے استحکام ہوا۔ اگر وجہ صرف یہی ہوتی تو ابراہیم کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو جاتا مگر ایسا نہیں ہوا ہمیں ابراہیم کے بعد کے ادوار میں بھی تلگو شعراء کی ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں قطب شاہوں کی دل کھول کر مدح کی گئی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور کا مشہور شاعر تھمیا گولکنڈہ کا کرنم تھا۔ اسنے اپنی نظم وجینتی و باسم میں دل کھول کر محمد قلی کی مدح کی ہے اور اپنی نظم میں اس بات کا صاف صاف اظہار کیا ہے کہ اسے بادشاہ کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔

تلگو شعراء کی سرپرستی کا سلسلہ ابوالحسن کے دور تک قائم رہا۔ اس دور کے عظیم شاعر رام داس کو تلگو ادب میں بڑا مقام حاصل ہے۔ اسکے کیرتن اب بھی آندھرا کے بڑے علاقے

بتے لگائے جاتے ہیں اس نے ابو الحسن کو سینٹ (Saint) مانا ہے۔

میں جس بات کو اجاگر کرنا چاہتا ہو وہ یہ ہے کہ تلگو شعراء کی سرپرستی قطب شاہوں کے غیر مسلم عوام سے گہرے روابط کو ظاہر کرتی ہے۔ ظاہر ہے نہ یہ شاعر امراء کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور نہ حکومت کے نظم و نسق میں بڑے عہدوں پر فائز تھے یا قالبفں تھے۔ یہ عوام کے نمائندے تھے جنکی سرپرستی کر کے قطب شاہوں نے عوام کو اس بات کا احساس دلایا کہ ان کے دور حکومت میں قابلیت مذہب اور ذات پات کی ترازو میں نہیں تولی جاتی۔ وینکٹ رامیا نے اسکی تصدیق یوں کی ہے کہ قطب شاہوں نے جو پالیسی اپنائی تھی وہ دو بنیادی اصولوں پر استوار تھی۔ مذہبی امور میں رواداری اور سیاسی امور میں مساوات قطب شاہوں کی حکومت جمہوری نہیں تھی۔ حکمران مطلق العنان ہوتا تھا جسکی مٹھی میں حکومت کا نظم و نسق عدلیہ اور مالیہ ہوتے تھے۔ لیکن قطب شاہی بادشاہوں نے لپنے اختیارات کا غلط استعمال کم از کم رعایا کے امور میں کبھی نہیں کیا۔ حکومت کے عہدے قابلیت کی بنیاد پر دیے جاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں غیر ملکیوں خاص کر ایرانیوں کا حکومت کے امور میں بڑا اقتدار تھا لیکن یہ غیر ملکی جنہیں تاریخ میں آفاقی یا غریب کہا جاتا ہے زیادہ تر شہروں میں مقیم تھے اسی لئے گاؤں کا سارا نظم و نسق ہمیشہ ہی غیر مسلموں کے ہاتھ میں رہا۔ خاص طور پر حساب کتاب کے معاملات برہمنوں کے ہاتھ میں تھے۔ قطب شاہی نظم و نسق میں برہمنوں کی اتنی بڑی تعداد کام کرتی تھی کہ تھیونات نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ عبد اللہ قطب شاہ کی والدہ برہمن تھیں اس لئے وہ ہمیشہ برہمنوں میں گھرا رہتا تھا۔ قریب قریب ہر حکمران کے دور میں ہندو عہدیداروں کا وجود ملتا ہے لیکن ابو الحسن کے دور میں مادنا میر جملہ کے عہدے پر فائز تھے اور انکے بھائی اکنا فوج کے منسٹر تھے۔ ان دو برہمن بھائیوں کا نظم و نسق کے امور میں اس قدر اختیار تھا کہ گولکنڈے پر اورنگ زیب کے حملے کی یہ بھی ایک وجہ بن گئ۔

نظم و نسق میں دو زبانوں کے استعمال کا فارمولا کوئی نیا نہیں ہے۔ قطب شاہی حکمرانوں نے سب سے پہلے اسے رائج کیا۔ عبد اللہ قطب شاہ کے دور اور اسکے بعد کے ادوار کے

فرمین جو ہمیں دستیاب ہوئے ہیں وہ فارسی اور تلگو دونوں زبانوں میں ہیں ۔اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ مذہبی رواداری کے ساتھ ساتھ قطب شاہوں نے لسانی رواداری کی بنیاد بھی رکھی اور اسے مضبوط بھی کیا۔اسی لئے اگر آج اردو والے سرکاری فرامین دو زبانوں تلگو اور اردو میں شائع کرنے کا مطالبہ کررہے ہیں تو یہ جائز بھی ہے اور ہماری روایات سے مطابقت بھی رکھتا ہے ۔قطب شاہوں کا اپنی ہندو رعایا کے ساتھ رواداری کا برتاو کوئی سیاسی مجبوری نہ تھی بلکہ یہ اس تہذیب کا حصہ تھا جسے انہوں نے قبول بھی کیا اور پروان بھی چڑھایا۔ صاف لفظوں میں انکی پالیسی یہ تھی کہ انہوں نے رعایا کو ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں ایک دوسرے کا ساتھی بنایا۔ جس طرح عیدوں کے علاوہ محرم کے رسومات میں ہندو بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اسی طرح بسنت اور مرگ میں نہ صرف مسلم عوام بلکہ قطب شاہی حکمران بھی بھر پور حصہ لیتے تھے ۔جسکا ثبوت محمد قلی اور عبداللہ قطب شاہ کے شعری مجموعوں میں اب بھی موجود ہے ۔قطب شاہوں کی اس پالیسی کو آصف جاہوں نے بڑی حد تک باقی رکھا اور رواداری اور بھائی چارگی کے اقدار حیدرآباد کی تہذیب کی بنیاد بن گئے ۔ہم اسی تہذیب کے ورثہ دار ہیں ۔اس لئے اسے باقی رکھنا اور اسے اپنے بعد آنے والی نسلوں تک پہنچانا ہماری بڑی ذمہ داری ہے ۔

(سیمنار ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد)

اقتباسات

(۱) شیروانی ہارون خان ۔ہسٹری آف قطب شاہی ڈیناسٹی ۔ صفحہ (۴۲)

(۲) شیروانی ہارون خان ۔ہسٹری آف قطب شاہی ڈیناسٹی ۔ صفحہ (۱۶۸)

(۳) واسومتی ۔ تلگو لٹریچر ڈیورنگ قطب شاہی پیریڈ ۔ صفحہ (۹۷)

(۴) واسومتی ۔ تلگو لٹریچر ڈیورنگ قطب شاہی پیریڈ ۔ صفحہ (۵۶)

(۵) وینکٹ رامیا ۔ دی قطب شاہس ۔ صفحہ (۱۴)

دور قطب شاہی کے دو بزرگ

پیشوایان سلطنت

بہمنی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی دکن میں جو پانچ سلطنتیں ابھریں ان گولکنڈہ کی ریاست کی بڑی اہمیت ہے۔ سیاسی معاشی معاشرتی اور مذہبی میدانوں میں گو ا کے حکمرانوں نے بھرپور حصہ لیا۔ لیکن دور وسطی کے دوسرے تاریخ دانوں کی طرح گو ا کے تاریخ دانوں نے بھی اپنی نگارشات کو سیاسی حالات جنگوں اور بغاوتوں کے قلمبند کر تک محدود رکھا۔ حالانکہ گولکنڈے کی تاریخ کا روشن باب مذہبی رواداری بھائی چارگی اور سے عبارت ہے۔ تاریخ گولکنڈہ کے اس روشن باب میں قطب شاہی حکمرانوں کے رد بدوش اس دور کے صوفیائے کرام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ دکن میں یہ روایت مشہور ہے یہاں چودہ سو پالکیاں آئی ہیں۔ یعنی چودہ سو صوفیائے کرام یہاں آکر بس گئے۔ چنانچہ دکر کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں صوفیوں کے مزارات اور خانقاہیں موجود نہ ہوں۔ خود حیدر آ میں بڑی تعداد میں صوفیائے کرام کی درگاہیں موجود ہیں۔

ان صوفیائے کرام کے درمیان کم از کم چار بزرگ ایسے تھے جنہیں سلطنت قط شاہی کے نظم ونسق میں بڑا دخل تھا۔ حضرت میر مومنؒ حضرت علامہ ابن خاتونؒ حضر حسین شاہ ولیؒ اور حضرت شاہ راجوؒ

حضرت حسین شاہ ولیؒ اور حضرت شاہ راجوؒ دونوں خانوادہ حضرت خواجہ بندہ نو گیسو درازؒ سے تھے۔ حسین شاہ ولی گلبرگہ سے ابراہیم قطب شاہ کے دور میں وارد گولکنڈ ہوئے۔ ابراہیم نے انہیں دس ہزار سپاہیوں کا سپہ سالار مقرر کیا اور محکمہ تعمیرات کی سار ذمہ داری سونپ دی۔ حضرت شاہ راجو عبداللہ قطب شاہ کے دور میں گولکنڈہ آئے۔ گولکنڈہ آخری تاجدار ابوالحسن قطب شاہ حضرت کا مرید تھا اور بادشاہ بننے سے پہلے اس نے حضرت ک

خانقاہ میں ۴۴ برس گذارے تھے۔ان دونوں نے اقتدار اور مال و متاع کی فروانی کے باوجود اپنی ساری زندگی یوں گذاری کہ گولکنڈے کے عوام نے انہیں صوفی مانااوران کی رحلت کے بعد ان کے مزار درگاہ بن گئے جہاں آج بھی عوام کی ایک کثیر تعداد ملتی ہے۔

ان دو صوفیائے کرام کے علاوہ تاریخ گولکنڈے میں اور دو علماء کے اسم گرامی آتے ہیں۔جنھوں نے دربار سے وابستگی اور نظم و نسق کے اعلی ترین عہدہ پیشوائے سلطنت پر فائز ہونے کے باوجود یوں زندگی گذاری کہ انکی رحلت کے بعد ان کے مزار مقدس درگاہوں میں بدل گئے۔ان کی مزاروں پر وہی رسوم ادا ہوتے ہیں جو حیدرآباد کے دوسرے صوفیائے کرام کی مزاروں پر ادا کئے جاتے ہیں۔حضرت میر مومنؒ اور علامہ ابن خاتونؒ کے مزار پر ہر روز کثیر تعداد میں لوگ حاضری دیتے ہیں۔منتیں مانگتے ہیں۔ہر سال مراسم عرس ادا کئے جاتے ہیں جن میں حیدرآباد کے مختلف محلوں سے پنکھوں کے جلوس بڑے اہتمام سے مزار مبارک پر لائے جاتے ہیں۔دلچسپ حقیقت یہ ہیکہ حیدرآبادی عوام نے یہ بھلا دیا ہے کہ یہ دونوں بزرگ پیشوائے سلطنت تھے۔حیدرآبادی عوام میں اب ان کا وقار صرف اور صرف بزرگان دین کی ہی حیثیت سے ہے۔

حضرت میر مومنؒ کا اسم گرامی میر محمد مومن تھا لیکن حضرت میر مومن میر صاحب کے نام سے مشہور تھے۔حضرت کے اسم گرامی کی سند ہمیں شہنشاہ ایران شاہ عباس صفوی کے خط سے ملتی ہے جو ۱۰۲۰ھ میں شہنشاہ نے حضرت کو اپنے قاصد کے ذریعہ سے روانہ کیا تھا۔اس خط میں شاہ عباس نے انہیں میر مومنؒ استرآبادی کے نام سے مخاطب کیا ہے۔میر مومنؒ کی عظمت کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ اس دور میں جب کہ سلطنت کے اکثر امراء خطاب سے سرفراز کئے جاتے تھے۔حضرت کا کوئی خطاب نہیں تھا۔

حضرت میر مومنؒ کے والد گرامی کا نام سید علی شرف الدین سما تھا لیکن حضرت نے اپنے والد کا نام اپنے رسالہ مقداریہ میں صرف علی الحسنی لکھا ہے لیکن اسکندر بیگ ترکمان نے تاریخ عالم آرا عباسی میں حضرت کے والد کا پورا نام سید علی شرف الدین سما لکھا ہے۔حضرت کے والد علم و فضل کی دنیا کی نامور ہستی تھے اور اہل ایران آپکی علمیت کو جانتے اور مانتے تھے۔

حضرت میر مومن ۹۸۹ھ میں وارد گولکنڈہ ہوئے۔ اس وقت گولکنڈہ پر محمد قلی قطب شاہ کی حکمرانی تھی۔ گولکنڈہ پہنچتے ہی وہ پیشوائے سلطنت نہیں بنائے گئے بلکہ اک عرصے تک وہ اپنے علمی اور مذہبی مشاغل میں مصروف رہے۔ اس عرصے میں حضرت کے علم و فضل کے چرچے سلطنت کے طول و عرض میں پھیل گئے۔

محمد قلی نے ۹۹۳ھ میں حضرت میر مومنؒ کو اپنا پیشوائے سلطنت مقرر کیا۔ صاحب عالم آرا عباسی کے مطابق حضرت کے پیشوائے سلطنت مقرر کئے جانے کے بعد محمد قلی نے سلطنت کے سارے کام حضرت کے سپرد کر دیئے۔

حضرت نے بادشاہ کے اعتماد کو پوری طرح نبھایا۔ سنہ ۱۰۰۰ھ میں جب شہر حیدر آباد کی بنیاد رکھی گئی تو شہر کا پہلا سرسری خاکہ حضرت ہی نے بنایا۔ شہر کی تعمیر شروع ہوئی تو حضرت نے ہر ہر قدم پر رہنمائی کی جب بادشاہ کے محل جلوخانے کے داخلے کی کمان مکمل ہوئی تو حضرت نے اس کے برابر ایک پتھر کا ستون تعمیر کروایا۔ اس ستون پر ایک تعویذ کندہ کروایا جس کا اثر یہ تھا کہ کوئی شخص کسی برے ارادے سے محل میں داخل ہو تو اس کا ارادہ پورا نہ ہو پاتا۔ اسی تعویذ کی بنا پر جلوخانے کی کمان، کمان سحر باطل کہلاتی تھی۔ قطب شاہوں کے زوال کے بعد بھی یہ تعویذ موجود تھا۔ لیکن پھر یہ لاپتہ ہو گیا۔

محمد قلی کے دور میں حضرت کے مقام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت کے سوا کسی کو بھی پالکی میں سوار ہو کر جلوخانے کی کمان سے محل میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ علی بن طیفور نے اپنی کتاب حدایق السلاطین میں یہ صحیح لکھا ہے کہ حضرت کی یہ عزت ان کے عالم ہونے کی وجہ سے تھی نہ کہ انکے پیشوائے سلطنت ہونے کی وجہ سے۔ اسلئے حضرت کے بعد سوائے ان کے شاگرد علامہ ابنؒ خاتون کے کسی کو یہ اجازت نہیں دی گئی۔

حضرت علم جفر اور علم نجوم کے عالم تھے۔ اس دور کی تاریخوں کے علاوہ اس کا ثبوت حضرت کا وہ قطعہ تاریخ ہے جو آپ نے محمد سلطان کی پیدائش کے موقع پر لکھا تھا۔ اس تاریخی قطعہ کا ایک مصرعہ:

" سرور عالم شوی در ظل پدر "

اس بات کا اعلان تھا کہ محمد قلی کے بعد اس کا بھتیجا محمد سلطان قطب شاہی سلطنت کا بادشاہ ہوگا۔

سلطان محمد کو بچپن ہی سے محمّد قلی نے حضرت کی شاگردی میں دیدیا تھا لیکن حضرت میر مومن کا وقار سلطنت میں اعلیٰ عہدے یا اختیارات کی بناء پر نہ تھا بلکہ ان کے علم و فضل نے انھیں سلطنت قطب شاہیہ کا عظیم المرتبت عالم بنادیا تھا۔ اس بات کا ثبوت عباس شاہ صفوی کے خط سے ملتا ہے شہنشاہ ایران نے حضرت کو ان القاب سے مخاطب کیا۔

" سیادت و نقابت پناہ افادت مجمع الفضائل دستگاہ

لیکن اپنے علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ حضرت نے پیشوائے سلطنت کی حیثیت سے بھی عظیم کارنامے انجام دیئے۔

حضرت کی سوجھ بوجھ اور سلطنت کی بہبودی کے لئے خدمت کا پہلا موقع اس وقت آیا جب عباس شاہ صفوی کا قاصد اکز لو سلطان شہنشاہ ایران کا خط لئے گولکنڈہ پہنچا۔ شہنشاہ ایران نے اس خط میں محمد قلی کی صاحبزادی حیات بخش بیگم کی اپنے لڑکے کے ساتھ شادی کا پیام بھجوایا۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ اگر محمد قلی شادی سے انکار کرتا تو گولکنڈہ اور ایران کے گہرے تعلقات ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتے اور اگر شادی پر رضامند ہوجاتا تو محمد قلی کے بعد جانشینی کا قضیہ کھڑا ہوجاتا۔ صاحب تاریخ محمد قطب شاہ کے مطابق اس نازک مرحلے پر میر مومن کی فراست کام آئی۔ حضرت نے محمد قلی کی صاحبزادی کا عقد سلطان محمد کے ساتھ کروادیا۔ اس تدبیر سے دونوں مشکل مسئلوں کا حل نکل گیا۔ گولکنڈہ کی ایران کے ساتھ دوستی بھی برقرار رہی اور محمد قلی کے بعد اس کے داماد سلطان محمد کو تخت نشینی کا حق بھی پیدا ہوگیا۔

سلطان محمد کو تخت نشین کرنے کا فرض بھی محمد قلی نے حضرت ہی کے سپرد کیا تھا صاحب تاریخ محمد قطب شاہ کے مطابق محمد قلی نے حضرت کو وصیت کی تھی کہ اس کے بعد و سلطان محمد کو گولکنڈہ کی سلطنت کا فرمانروا بنائیں گے۔ اس وصیت کے مطابق جب ۱۰۲۰ھ میر محمد قلی نے وفات پائی تو حضرت میر مومنؒ نے فوراً ہی سلطان محمد کی تخت نشینی کا اعلان کردیا حضرت کے اس اقدام نے گولکنڈہ کو جانشینی کی جنگوں سے محفوظ رکھا۔

سلطان محمد کے تخت نشین ہوتے ہی حضرت میر مومنؒ کے اعزاز و اکرام میں ہزاروں گنا اضافہ ہو گیا۔ سلطان محمد نہ صرف حضرت کا شاگرد تھا بلکہ حضرت کی تربیت نے اسے مذہب اور علم کا شیدا بنادیا تھا۔ حضرت پر سلطان محمد نے دل کھول کر نوازش کی۔ جاگیریں عطا کیں مال و زر سے نوازا، لیکن یہ سب کچھ پا کر بھی حضرت میر مومنؒ نے اپنا طرز زندگی نہیں بدلا۔ دولت کو عوام کی بھلائی کے لئے صرف کیا۔ جاگیروں میں مسجدیں، خانقاہیں اور مدرسے تعمیر کئے۔ تالاب بنوائے۔ خدمت خلق میں اپنا سارا اثاثہ خرچ کیا۔ خود کو علمی دنیا سے وابستہ رکھا حضرت کے علمی کارناموں میں سب سے عظیم کارنامہ حضرت کا رسالہ مقداریہ ہے۔ اس رسالہ میں حضرت نے اوزان و پیمانہ جات کا مطابق شرع صحیح صحیح ناپ تول بتلایا ہے۔ حضرت کا یہ رسالہ جس کا مخطوطہ سالار جنگ میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے۔ دور قطب شاہی میں اوزان و پیمانہ جات کے لئے مستند سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت میر مومنؒ نے نثر و نظم دونوں میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن حضرت کا کوئی دیوان دستیاب نہ ہو سکا۔ کچھ اشعار جو مختلف تاریخ کی کتابوں میں محفوظ کر دیئے گئے تھے ہمارے لئے سرمایہ ہیں اور حضرت کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔

حضرت میر مومن نے حیدرآباد کی تعمیر کے وقت ہی شہر کے مشرقی حصہ میں ایک قبرستان کے لئے جگہ محفوظ کر لی تھی۔ اس قبرستان کے بیچ میں حضرت کا مزار مقدس ہے۔ قبرستان حضرت کے نام کی مناسبت سے دائرہ میر مومن کہلاتا ہے اور اسی میں دور قطب شاہی اور آصف جاہی کی نامور ہستیوں کے مزار ہیں حضرت کا مقبرہ سادہ سی مستطیل عمارت ہے جس کی چھت مسطح ہے۔

چاروں کونوں پر چار مینار اور بیچ میں دو چھوٹے مینار ہیں۔ اس مقبرے کے بیچ میں حضرت نے اپنی قبر کی جگہ محفوظ کی تھی لیکن حضرت کی زندگی میں ان کے اکلوتے فرزند حضرت میر مجداد الدین کا عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔ حضرت نے اپنی قبر کی جگہہ اپنے بیٹے کی قبر بنادی۔ حضرت کا مزار ہال کے مغربی گوشے میں ہے۔ سنگ سیاہ سے تعمیر کئے ہوئے مزار پر جو لوح ہے وہ صاف ہو گئی ہے اور کچھ بھی لکھا باقی نہیں ہے۔

حضرت میر مومن یقیناً قطب شاہی دور کی عظیم ہستیوں میں سے تھے۔ طویل عرصے تک پیشوائے سلطنت رہے۔ حکومت کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی پالسیوں کی تدوین میں آپ کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔ لیکن ان تمام اختیارات کے باوجود حضرت میر مومن نے زندگی یوں گزاری کہ آپ کے انتقال کے بعد آپ کا مزار مرجع خلایق بن گیا۔ اب بھی زائرین کی ایک کثیر تعداد ہر روز مزار مبارک پر حاضری دیتی ہے۔ منتوں مرادوں کا سلسلہ رہتا ہے۔ مزار مبارک پر رکھے ہوئے پانی سے بن بیاہی ہوئی لڑکیاں غسل کرتی ہیں اور یہ بات عام طور پر مانی جاتی ہے کہ اس عمل کے بعد لڑکی کی شادی ہوجاتی ہے۔

حضرت کا وصال ماہ شعبان میں ہوا تھا۔ اسی مناسبت سے ہر سال شعبان میں حضرت کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ وہ سارے مراسم جو گولکنڈہ کے دوسرے صوفیائے کرام کی مزاروں پر ادا کئے جاتے ہیں حضرت کے عرس کے موقعہ پر انجام دیئے جاتے ہیں۔

حضرت میر مومنؒ کے بعد سلطنت گولکنڈہ کی پیشوائی کے عہدہ پر جس عظیم المرتبت شخصیت کا تقرر ہوا وہ علامہ ابن خاتونؒ تھے۔

آپ عراق کے ایک گاؤں اقلی میں پیدا ہوئے تھے۔ علامہ کی مادر گرامی حضرت شیخ بہاالدین عاملی کی ہمشیرہ تھیں۔ علامہ اپنی والدہ ماجدہ کی نسبت سے ابن خاتونؒ کہلانے لگے۔ اپنی تعلیم مکمل کر کے علامہ ۱۰۰۹ھ میں گولکنڈہ تشریف لائے اور حضرت میر مومن کے حلقہ تلامیذہ میں داخل ہوگئے۔ بہت جلد علامہ ابن خاتونؒ حضرت میر مومن کے سب سے معزز شاگرد بن گئے۔ حضرت میر مومن ہی کے ایماء پر علامہ ابن خاتون کو ۱۰۲۵ھ میں گولکنڈہ کے سفیر کی حیثیت سے ایران بھیجا گیا۔ علامہ گیارہ برس تک ایران میں مقیم رہے اور سفارت کے کام کو نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ ۱۰۳۸ھ میں علامہ ایران سے گولکنڈہ واپس ہوئے اور گولکنڈہ کی عظیم سلطنت کے پیشوا مقرر ہوئے۔ ریاست گولکنڈہ کی یہ خوش نصیبی تھی کہ نظم ونسق کے سب سے بڑے عہدے پر حضرت میر مومن کے بعد علامہ ابن خاتون کا تقرر ہوا۔ پیشوائے سلطنت کی حیثیت سے علامہ ابن خاتون نے قابل قدر کارنامہ انجام دیئے۔ آپ کی فعال شخصیت ہی کی وجہ سے دور محمد قطب شاہ تاریخ قطب شاہی کا سب سے پر امن دور بن

گیا۔ لیکن علامہ ابن خاتون کا عظیم کارنامہ منصب پیشوائی کو پورا کرتے ہوئے چار بڑی کتابوں کی تصنیف ہے شرح ارشاداں اذہان، شرح اربعین، جامع عباسی اور شرح جامع عباسی دور قطب شاہی کی عظیم کتابوں میں شامل ہیں۔

شرح ارشادال اذہان یخ جمال الدین ال منصور حسین بن یوسف ال ہلالی کی معرکتہ الارا کتاب احکام الایمان کی شرح ہے جس میں پندرہ ہزار فقہی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔

شرح اربعین شیخ الاسلام یخ بہاؤالدین عاملی کی معرکتہ الارا کتاب اربعین کی شرح ہے جس میں علامہ نے چالیس احادیث نبوی کی تشریح فرمائی ہے۔

علامہ نے اس کتاب کے لکھنے میں بڑی احتیاط برتی ہے۔ ہر حدیث کی عربی عبارت کے نیچے اس کا فارسی ترجمہ ہے، پھر حدیث کے اسناد دیئے گئے ہیں تاکہ اس کے معتبر ہونے کی دلیل فراہم کی جائے، پھر حدیث کی عالمانہ تشریح کی گئی ہے۔

علامہ نے یہ کتاب اپنے استاد شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں مکمل کر کے اسے اپنے استاد کی خدمت میں پیش کی اور شیخ السلام نے اس پر مقدمہ لکھا۔

علامہ کی تیسری معرکتہ الارا تصنیف جامع عباسی ہے۔ اس ضخیم کتاب کو علامہ کے استاد شیخ الاسلام نے ۱۰۲۹ھ میں شاہ عباس صفوی کی خواہش پر لکھنا شروع کیا تھا لیکن کچھ ابواب کے لکھنے کے بعد شیخ الاسلام کا انتقال ہو گیا۔ علامہ نے اپنے استاد کے اس ادھورے کام کو نہ صرف پورا کیا بلکہ اس کو ختم کرنے کے بعد اس کی ایک شرح بھی لکھی۔ اپنی شرح میں علامہ نے ان فقہی مسائل کی تشریح کی ہے جو جامعہ عباسی میں تشنہ رہ گئے تھے۔

علامہ کی چوتھی تصنیف کتاب ال امامت ہے۔ ۱۳×۸ کی تختی کے ۴۲۹ صفحات کی یہ ضخیم کتاب حضرت علی کی زندگی اور فضائل پر مشتمل ہے۔

علامہ کے علمی کارنامے اس وجہ سے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ علامہ نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود علمی زندگی سے کنارا نہیں کیا بلکہ ایسی کتابیں لکھیں جن کا شمار دور قطب شاہی کے مذہبی لٹریچر میں بہت اونچا ہے۔

علامہ اپنی علمی اور سرکاری مصروفیتوں کے باوجود کبھی خدمت خلق سے غافل نہیں

ہے۔ علی بن طیفور نے اپنی کتاب میں علامہ کی مصروفیات کا جو خاکہ دیا ہے اس میں یہ بھی
لکھا ہے کہ ہر روز نماز فجر کے بعد علامہ ان طلباء کو درس دیتے جو تحصیل علم کی خاطر مکان پر جمع
ہوتے۔

ایک طرح سے علامہ کا مکان قطب شاہی دور میں علم و ادب کا مرکز تھا۔ علامہ اپنے مکان پر پابندی سے مشاعرے منعقد کرتے، جس میں اس دور کے قابل قدر شعراء جمع ہوتے اور اپنا کلام سناتے۔ علامہ کی وفات کے بعد ان کا مزار ایک سادہ سے مستطیل کمرہ میں بنایا گیا اس کمرے میں دو مزار ہیں ایک علامہ کا اور دوسرا ان کی اہلیہ کا۔ مزار پر زائرین کی کافی تعداد ہر روز آتی ہے۔ عرس کے موقع پر پنکھے کے جلوس مزار تک لائے جاتے ہیں۔

دور قطب شاہی کے دو بزرگ پیشوایان سلطنت گولکنڈہ کے روشن مینار تھے جن کی روشنی میں اک طرف تو قطب شاہی بادشاہوں نے اپنا راستہ پایا تو دوسری طرف عوام نے اسی روشنی میں بھائی چارگی اور یکتا کے ساتھ جینا سیکھا۔

(صوفی کانفرس۔ دہلی)

مرائت صادق کا تنقیدی جائزہ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دور وسطی کے سارے حقایق اور مواخذ اب مورخین کے ہاتھوں میں ہیں لیکن میرے اپنے خیال میں یوں نہیں ہے۔ حقائق کی تلاش اور ان کی چھان بین صحرائے تاریخ کے مسافر مورخ کا سب سے کٹھن کام بھی ہے اور اس کا متبرک منصب بھی۔ جانے ابھی کتنے ایسے مواخذ ہیں جو چشم مورخ سے پنہاں کتب خانوں، شخصی لائبریریوں، ریکارڈ آفسوں اور آرکائیز میں بند ہیں۔ لیکن یہ بھی اس دور کا المیہ ہے کہ سیمناروں اور کانفرنسس کی بڑی تعداد حقائق پر گفتگو تک محدود ہوتی ہے جن پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے۔

اسی لئے میں نے مورخ کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کرنے اور کاروان فکر و نظر میں اپنی حقیر کاوش کو شامل کرنے کے لئے محمد شفیع وارد کے مخطوطہ "مرائت صادق" کا انتخاب کیا ہے۔

یہ مغلوں کی تاریخ ہے جو بابر سے شروع ہوکر محمد شاہ کے سولہویں تخت نشینی کے سال پر ختم ہوتی ہے۔ مصنف کی تحریر اس کے صاحب علم ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ مقدمہ کی زبان بڑی خوبصورت ہے اور مصنف نے جابجا اپنے اشعار سے اس کو سنوار اور نکھارا ہے۔ اشعار کا مطالعہ اس کے صاحب طرز شاعر ہونے کا مکمل ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مقدمہ روایتی انداز میں حمد و نعت سے شروع ہوکر اہلبیت و اصحاب اہلبیت پر درود پر ختم ہوتا

ہے۔

مقدمہ کے صفحہ (۳) پر سنہ تالیف یوں ہے " در ہزار و یکصد و چہل دنہ ہجری " ۔
مصنف نے سبب تالیف کا اظہار خود ہی کیا ہے جو اپنی جگہہ اہمیت رکھتا ہے ۔ ورق پانچ پر اس کے بیان کے مطابق مرزا محمد صادق المخاطب بیرم خان ولد میرزا باقر بیرم خان مرحوم ابن روح اللہ خان بن خلیل اللہ خان بن میران نعمت الحسینی نے مصنف سے کہا کہ فرشتہ کی تاریخ یوں تشنہ ہے کہ اس نے مغلیہ سلطنت کی وسعت کشمیر، بنگالہ کے بعد اور خاص طور پر دکن کے حالات پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے ۔ محمد صادق نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس کی وضاحت یوں کی بابر سے اس وقت تک یعنی ۱۱۴۹ھ مطابق ۱۷۳۶ء تک دو سو ستر برس کے عرصے میں بارہ شہنشاہان تیموریہ نے ہندوستان پر حکومت کی لیکن فرشتہ نے صرف پہلے تین شہنشاہوں کی تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے ۔ محمد صادق نے مصنف سے خواہش کی کہ وہ باقی نو (۹) شہنشاہوں کی تاریخ لکھے جو ایک معنی میں فرشتہ کی تاریخ کا تسلسل قرار پائے ۔

مصنف نے اس کا اقرار کیا ہے کہ اس نے اپنی کتاب کا نام مراۃ صادق اسی لئے رکھا ہے کتاب میں طویل مقدمہ، انتساب اور وجہہ تالیف کے بیان کے بعد اصل تاریخ کا آغاز اکیسویں ورق سے ہوتا ہے ۔ بابر اور ہمایوں اور اکبر کے مختصر سے حالات کے بعد جہانگیر کا تذکرہ نسبتاً تفصیلی بھی ہے اور اہم بھی ۔ جہانگیر کی ولادت، قلعہ قندھار پر قزلباشوں کا حملہ اور ابتدائی حالات کا مفصل حال مصنف نے بڑی عرق ریزی سے لکھا ہے ۔ مصنف نے حالات کو سنہ واری ترتیب کے ساتھ لکھا ہے اس لئے مخطوطہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ جہانگیر سے مہرالنساء کی شادی، نور محل کا خطاب، اعتماد الدولہ کو پنجہزاری منصب اور اس کے بیٹے کو تین ہزاری منصب کا اعزاز ان سب کا تذکرہ مخطوطہ میں موجود ہے ۔ نور جہاں کے اقتدار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی حالات کو بھی مصنف نے قلمبند کیا ہے ۔ مخطوطہ کا یہ حصہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے Domination of Noorjahan Janta کو سمجھنے میں قابل لحاظ مدد ملتی ہے ۔

ورق نمبر ۸۲ سے شاہجہاں کے حالات کا آغاز ہوتا ہے ۔ حالات کو سنہ واری ترتیب کے

ساتھ مصنف نے چھان بین کے بعد لکھا ہے لیکن سب کچھ وہی ہے جو دوسری تاریخوں میں دستیاب ہے۔ البتہ مصنف نے ممتاز محل کی موت اور اس کی میت کو باغ زیبا آباد برہانپور میں محفوظ کر دینے کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف یہ لکھ کر اپنا بیان ورق ۱۱۱ پر ختم کر دیا ہے کہ تاج محل کا نقشہ خود شاہجہاں کا بنایا ہوا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

شاہجہاں کے بعد اورنگ زیب کے دور کی تاریخ جب دکن پہنچتی ہے تو مصنف یک بہ یک تاریخ ایران کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ ورق ۲۰۴ سے ۲۴۷ تک تاریخ ایران لکھی ہے جو شاہ اسمعیل سے شروع ہوتی ہے ورق ۲۴۸ سے پھر تاریخ ہند کا آغاز ہوتا ہے جو محمد شاہ کے سولہویں سال تخت نشینی پر ختم ہوتا ہے۔ ان معنی میں یہ کتاب تشنہ ہے کہ اسمیں مصنف نے اپنے مقصد تالیف کو پورا نہیں کیا ہے۔

مخطوطہ کمیاب ہے Dr. N. Marshall کی Moughals of India میں بھی اس مخطوطہ کا تذکرہ نہیں ہے۔ البتہ مصنف کی دوسری کتاب مراءت وارد کا تذکرہ ہے جس کو مصنف نے دو جلدوں میں لکھ کر میرزا محمد صادق کے والد میرزا محمد باقر کو پیش کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ مصنف کی ایک اور کتاب تاریخ چغتائی کا تذکرہ موجود ہے جو اسی کتاب کی توسیع ہے۔ جس میں مغلیہ تاریخ کو نادر شاہ کے حملے تک لکھا گیا ہے مخطوطہ کئی خوبیوں کا حامل ہے۔ مورخ کا شعور تاریخ فہمی قابل قدر ہے۔ مصنف نے Chronalogical Order کو اپنایا ہے اور واقعات کے جو سنہ دیئے گئے ہیں وہ دوسرے ماخذات کے دیئے ہوئے سنہ پر منطبق ہوتے ہیں۔

اس مخطوطہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے ان ادوار کے امراء کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جن کی تاریخ لکھی ہے۔ اکثر امراء کے مراتب ان کی منصب اور ان کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح جب کسی حملے یا فوج کشی کے حالات کو قلمبند کیا گیا ہے تو فوج کے کمانڈروں کے نام لکھے گئے ہیں۔ مخطوطہ اس اعتبار سے اور زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کہ اس کی مدد سے مغلیہ دور کے امراء کی تاریخ لکھنے میں مدد ملتی ہے۔

سالار جنگ میوزیم لائبریری میں محفوظ مخطوطہ اچھی حالت میں ہے اس لائبریری کے علاوہ اس کے نسخے مارشل کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق برٹش میوزیم انڈیا آفس لائبریری، رگھوبیر لائبریری اور ستیانندہ لائبریری میں موجود ہیں۔ مارشل نے اس کے ایک نسخہ کی نشاندہی جانکی پور لائبریری میں کی ہے اور مخطوطہ کا نمبر ۵۸ جلد سے دیا ہے۔ لیکن کیٹلاگ کی فراہم کردہ معلومات کے اعتبار سے یہ نسخہ جو صرف ۸۶ اوراق پر مشتمل ہے محمد شاہ کے سولہویں سال تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے جہاں مرائت صادق کا خاتمہ ہو گیا ہے اس لئے اس نسخے کو زیادہ سے زیادہ تاریخ چغتائی کا آخری حصہ مانا جاسکتا ہے۔ مرات صادق کا نسخہ ہر اعتبار سے کمیاب اور اہم بھی ہے۔ اس لئے اس کی جتنی جلد طباعت ہوسکے بہتر ہے۔

(سیمنار۔ خدا بخش لائبریری، پٹنہ)

نواب عنایت جنگ بہادر کے مورخین پر احسانات

کسی دور کسی ملک یا کسی شہر کی تہذیب، سماجی اقدار اور تمدنی معیارات تاریخ اور مورخ دونوں کی بنیادی ضرورت ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں تو اس کی اہمیت کچھ اور ہی بڑھ گئی ہے۔ اس لئے تاریخ کی شائد ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جو اس کے بیان سے خالی ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تہذیب و تمدن کا بیان کسی بھی کتاب کے صفحات پر پڑھکر سمجھ لینا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کسی بھی ملک، شہر یا خطہ کی تہذیب کو سمجھنے کے لئے اس مقام پر جانا وہاں کے لوگوں میں رہنا بسنا، ان کے عادات و اخلاق، رسم و رواج کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

حیدرآباد کی تہذیب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور حیدرآباد کے چار سو سال مکمل ہونے کے اعلان کے بعد سے بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن ان کتابوں، مقالوں اور مضامین کا بڑا حصہ Secondry Sources سے حاصل کیا ہوا ہے۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کاش عنایت جنگ بہادر اس وقت ہمارے درمیان موجود ہوتے تو کسی بھی مورخ کو حیدرآباد کی تہذیب اور یہاں کے تمدن کو سمجھنے میں کسی کتاب، مخطوطہ یا آثار کے مطالعہ کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ نواب صاحب حیدرآباد کی تہذیب کا جیتا جاگتا مرقع تھے یا یوں سمجھئے کہ حیدرآبادی تہذیب سمٹ کر نواب صاحب کے روپ میں حیدرآباد کی سرزمین پر سانس لے رہی تھی۔

نواب صاحب کے اخلاق مروت، انسانیت، جود و سخا، علم دوستی عادات و اطوار پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ سب رس کا ایک نمبر نواب عنایت جنگ کی شخصیت پر طبع ہو چکا ہے۔ اس لئے میں لکھی ہوئی باتوں کو پھر سے نہیں دہراونگا۔ لیکن اتنا ضرور لکھوں گا کہ نواب صاحب اس عظیم انسان کا نام تھا جس پر انسانیت ناز کرتی تھی۔ اگر انسان اوصاف حمیدہ کے

مجموعے کو کہتے ہیں تو پھر نواب صاحب کے لئے انسان عظیم کہنا بجا ہے اور انسانیت کے اقدار سے انصاف بھی اس مختصر سے مضمون میں میں نواب صاحب کے جس احسان کو قلمبند کرنا چاہتا ہوں وہ ان کا تاریخ اور تاریخ کے طلباء پر احسان ہے۔

میں نے نواب صاحب کو اس وقت سے دیکھا ہے جب میں ابتدائی جماعتوں کا طالب علم تھا۔ محرم کے عشرے کی مجالس میں میں اپنے والد محترم کے ساتھ "حسینیہ" پابندی سے جاتا تھا، اور جب ختم مجلس پر میں دروازے پر پہنچتا تو نواب صاحب کو ہر مومن کو سلام کرتا ہوا پاتا۔ مجھے ان کے سلام کرنے کا اسٹائل بڑا اچھا لگتا تھا۔ یہ تو میرا ابتدائی مشاہدہ تھا لیکن نواب صاحب سے ملنے اور بات کرنے کا موقع مجھے اس وقت حاصل ہوا جب میں علی گڑھ یونیورسٹی سے تاریخ میں ام۔ اے کر رہا تھا۔ میرا ایک مضمون تاریخ ایران تھا۔ بڑی تلاش کے باوجود مجھے کوئی ایسی کتاب نہیں مل سکی تھی جس کی مدد سے میں اس مضمون کی تیاری کر سکتا۔ میں تب تک جانتا نہ تھا کہ نواب صاحب تاریخ پر کتنا عبور رکھتے ہیں۔ میرے والد مولوی احمد حسین صاحب مرحوم کا مضمون بھی تاریخ ہی تھا اور وہ نواب صاحب کے کتب خانے اور اس میں محفوظ خزانے سے واقف تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں نواب صاحب سے جا کر اس سلسلہ میں بات کروں۔ میں ڈرا سہما نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر پہنچا۔ اطلاع کروائی اور جب اجازت پائی تو ان کی خدمت میں پہنچا۔ بڑی شفقت سے ملے۔ بیٹھنے کا حکم فرمایا اور پھر آنے کا مقصد دریافت کیا۔ میں نے بیان کیا تو بے حد خوش ہوئے۔ کرسی سے اٹھے اور چند منٹ بعد Sykes کی HISTORY OF PERSIA میرے ہاتھ میں تھمادی۔ میں دن بھر پڑھتا رہا اور کچھ لکھا بھی۔ چار پانچ بجے کے قریب تشریف لائے۔ میں نے جو لکھا تھا اسے دیکھا اور پھر بولنے لگے۔ آج بھی میرے حافظہ میں وہ آواز اور وہ عالمانہ لکچر محفوظ ہے۔ جب میں نواب صاحب کے دولت کدہ سے باہر آیا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں نے ایران کے صفوی دور کی مکمل تاریخ پڑھ لی ہو۔

مجھے پھر کبھی نواب صاحب سے گفتگو کا موقع نصیب نہیں ہوا یا یہ کہوں کہ مجھے اتنی جرات کبھی نہیں ہوئی کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تاریخ کے کسی مسئلہ پر گفتگو کا شرف

حاصل کروں۔ نواب صاحب کا طبعی وجود اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہے لیکن ان کا فکری وجود اب بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ آج مورخ جن باتوں کو لکھ رہے ہیں۔

نواب صاحب نے انہیں برسوں پہلے دہرایا تھا۔ جناب باقر کاظمی نے سب رس کے عنایت جنگ نمبر میں اپنی نواب صاحب سے ایک طویل ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے نواب صاحب کے ان زرین الفاظ کو نقل کیا ہے۔

"فرمایا کہ تاریخ ایسا علم و موضوع نہیں ہے جسکے متعلق قطعی طور پر کسی بات کا فیصلہ کیا جاسکے۔ یہ تو اپنی اپنی تحقیق و تجسس پر منحصر ہے لہذا تاریخ کے سلسلے میں ایک طالبعلم کو نہایت محتاط رہنا چاہیئے۔ صفحات کی نقل کرکے پرانی کتاب کو نیا جامہ پرانی لکھت کو نیا طرز کتابی دینا، مواد کے پیراگراف عنوانات و ابواب کا تعین کر دینا یہ سب لباس آرائی ہے شخصیت آرائی نہیں۔ (عنایت جنگ نمبر صفحہ ۵)

میں سوچتا ہوں کہ کاش نواب صاحب کے یہ زرین الفاظ تاریخ کے ریسرچ اسکالرس نے سمجھ کر اپنا لیئے ہوتے تو آج ریسرچ کی دنیا کا یہ حال نہ ہوتا جو ہے۔

دنیا انسانوں کے بہتے ہوئے دریا کا نام ہے۔ لوگ آتے بھی ہیں اور چلے بھی جاتے ہیں لیکن ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو دنیا سے تو چلے جاتے ہیں لیکن ان کا تذکرہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے لئے دولت، جائداد، جاہ و حشم سمیٹنے میں مصروف نہیں ہوتے بلکہ اپنے سرمایہ کو دوسروں پر نچھاور کرکے خوش ہوتے ہیں۔ نواب صاحب کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ انہیں تاریخ اور دکن کی تہذیب سے والہانہ عشق تھا۔ زندگی بھر تلاش کر کرکے نایاب مخطوطات، فرامین اسناد اکھٹا کئے لیکن ان کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ اس عظیم سرمایہ کو صرف اپنے اور اپنے خاندان کا ورثہ نہیں بنایا۔ جب زور صاحب نے ادارے کا قیام عمل میں لایا تو نواب صاحب نے اس سرمایہ کا بڑا حصہ ادارے کے حوالے کیا۔ محترم اکبرالدین صدیقی نے لکھا ہے کہ

نواب صاحب نے زور صاحب کی تجویز سنی تو پھولوں نہ سمائے اور اپنی عطا کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ عطائے ایک رقعے

سے لیکر ایک دفتر تک ہیں اور سنگریزوں سے لیکر جواہر تک
مخطوطات میں تقریباً سو کا تذکرہ مخطوطات کتب خانہ
ادارہ ادبیات اردو جلد اول تا پنجم میں آگیا ہے اور ابھی
ایسے کئی مخطوطات ہیں جن کا ذکر باقی ہے۔ (عنایت جنگ نمبر صفحہ ۲۹)

آپ سب ہی مخطوطات کی قیمت سے واقف ہیں۔ اگر صرف ۱۰۰ مخطوطات ہی کی قیمت کا اندازہ لگائیے تو لاکھوں روپئے تک پہنچے گا۔ اتنی بڑی دولت ایک دوست دوسرے کو عطا کرے تو اسے رفیق صادق کہنا چاہیئے۔ اس لئے میں نواب صاحب کو زور صاحب کا حقیقی دوست سمجھتا ہوں۔ مخطوطات کے علاوہ نواب صاحب نے ادارے کو کئی قیمتی اشیاء پینٹنگس اور نوادرات سے نوازا۔ یہ ان کی زور صاحب اور ادارے سے والہانہ محبت کے ثبوت کے طور پر اب بھی موجود ہیں۔

تاریخ کے طلباء پر نواب صاحب کا احسان یہاں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس کا احاطہ حیدرآباد سے دہلی کی نیشنل آرکائیوز تک ہے۔ نواب صاحب نے نیشنل آرکائیوز کو بھی بے حساب مخطوطات، فرامین اور اسناد روانہ کئے جو آج بھی وہاں محفوظ ہیں اور ہزاروں اسکالرس ان سے فیض یاب ہورہے ہیں۔

آخر میں اس مختصر سے مضمون کو یہ کہہ کر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ نواب صاحب اپنی زندگی میں جیتی جاگتی تاریخ تھے۔ جب وہ دنیا رخصت ہوگئے تو حیدرآباد کی تاریخ کا سنہری کردار بن گئے

(سمینار۔ ادارادبیات اردو)

علامہ نجم آفندی کی رثائی شاعری

شاعری حساس دل اور روشن فکر سے عبارت ہے جو غم کے سائے میں پلتی، بڑھتی اور سنورتی ہے۔ صاحبان فکر و نظر نے غم کا راستہ انسانی خواہشات کے ساتھ جوڑا ہے۔

Miseries are the out come of the Desires لیکن داخلی اور خارجی غموں کی طویل فہرست میں ایک غم ایسا بھی ہے جو خواہشات کا رد عمل نہیں ہے بلکہ اس کا وجود ہی خود خواہش ہے۔ غم شہیدان کربلا پچھلی چودہ صدیوں سے ہر دھڑکتے دل اور ہر حق پسند نظر کا مرکز رہا ہے۔ تاریخ کے طالب علم کسی واقعہ، حادثہ یا کسی انقلاب کی اہمیت و عظمت کا اندازہ یہ دیکھکر کرتے ہیں کہ اس کا اثر سماج پر کیا مرتب ہوا۔ اس سے کتنے صاحبان فکر و نظر نے روشنی پائی، اور اس سے کتنے جاگتے ہوئے ذہن مربوط ہوئے۔ تاریخ کے اس معیار کی بناء پر واقعہ کربلا کی عظمت دنیا کے تمام واقعات سے زیادہ ہے اس لئے کہ اس واقعہ نے ذہنوں کو جتنا متاثر کیا۔ کسی اور واقعہ نے نہیں کیا۔ ہر دور اور ہر زمانہ کے صاحبان فکر و نظر اس سے روشنی حاصل کرتے رہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری کا قابل لحاظ حصہ کربلا سے راست یا بالواسطہ مربوط ہے۔

مرثیہ، سلام اور نوحہ موضوعاتی اعتبار سے فن شاعری کے تین نمایاں اصناف ہیں جن میں بے حساب شعراء نے شعر کہیں ہیں۔ مرثیہ کی بہ نسبت ہیت اور موضوع کی تبدیلی کے تجربے سلام اور نوحے میں اس صدی کے تیسرے دہے تک نمایاں نہیں رہے کم از کم حیدرآباد کے شعراء نے ان میں نہ کوئی تبدیلی کی نہ اس کی ضرورت کو محسوس کیا۔ ایک ہی راستے اور ایک ہی ڈگر پر چلنے والے شعراء کے اس کاروان کو نیا جادہ عطا کرنے کا منصب حیدرآباد میں علامہ نجم آفندی کو حاصل ہوا۔ علامہ اس اعتبار سے اس کاروان کے رہبر ہیں جو آج بھی ان ہی کے بتائے ہوئے راستے پر تیزی سے آگے بڑھ رہا ہیں۔

علامہ ۱۹۳۵ء میں آگرہ سے حیدر آباد تشریف لائے۔آگرہ ہی کے قیام کے دوران علامہ کی فکر و فن کا شہرہ شمالی ہند میں ہو چکا تھا۔ابتدائی دور ہی کے شاعری کے لب و لہجہ اور ندرت فکر نے اساتذہ سخن کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اس دور میں آگرہ کی مجلسوں میں کثرت سے پڑھے جانے والے علامہ کے سلام کے دو شعر یہ ہیں۔

غل ہے فوج شام میں عباسؑ کو پانی نہ دو
ان کے تیور کہتے ہیں دریا اٹھا لے جائیں گے
نجم اڑ اڑ کر ہماری خاک کے ذرے ہمیں
یا نجف لے جائیں گے یا کربلا لے جائیں گے

آگرہ ہی کے قیام کے دوران علامہ نجم آفندی کو شاعر اہلبیت کے خطاب سے نوازا گیا اور علامہ نے اپنی ساری زندگی اپنی نسبت کو سنبھالے رکھا۔زندگی میں بے حساب نشیب و فراز آئے لیکن اس راہ پر علامہ کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔انہوں نے اپنی زندگی مدح اہلبیت کے لئے وقف کر دی تھی۔زندگی کے کسی موڑ پر علامہ نے اپنی آئیڈیالوجی میں نہ کوئی تبدیلی کی اور اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی۔

پستہ قد گول چہرہ سرخ و سفید رنگ، چھریرا بدن آواز میں رعب، چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایمان کی چمک لئے علامہ نے ہند و پاک کی ادبی اور مذہبی محفلوں کو برسوں تک زینت بخشی۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی علامہ کی تصویر لفظوں میں یوں پیش کرتے ہیں۔

"وضع قطع پرانی ہے۔اخلاق و کردار کے اعتبار سے مشرقی تمدن کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔مروت و صغداری، ایفائے وعدہ، حسن و معاشرت اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ یکساں برتاؤ آپ کے کردار کی وہ خصوصیات میں جو ہر شخص کے دل میں جگہ کر لیتی ہیں۔"

علامہ کی لفظوں میں کھینچی ہوئی یہ تصویر میں نے آپ کی خدمت میں اس لئے پیش کی ہے کہ مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ علامہ کی فکر و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا۔اس لئے جو بھی کہا اسر

میں صداقت فکر و عمل موجود رہے ۔ دل کی آواز تھی اس لئے دلوں کو متاثر کرتی رہی ۔

علامہ نے رثایہ شاعری خاص طور پر نوحوں کو پیغام شہیدان کربلا سنانے کا ذریعہ بنایا، خود ہی فرماتے ہیں ۔

مظلوم کے ماتم سے زمانے کو ہلادو
نوحے میں پیام لب معصوم سنادو
کہدو کہ اشاعت ہے ہمیں درد کی مطلوب
مامور ہیں تبلیغ محبت پہ بتادو
کچھ بھولے ہوئے سے نظر آتے ہیں مسلمان
پھر اسوہ شبیرؑ ذرا یاد دلادو
کیا جاگ رہے ہو شب عاشور اکیلے
ہم کہتے ہیں سوئی ہوئی دنیا کو جگادو

نوحے کی روایتی ہیئیہ شاعری سے ہٹ کر علامہ نے اپنے نوحوں میں مدح اہلبیت کے طریقے کو اپنایا لیکن علامہ کی مدح کا انداز بھی ان کا اپنا تھا ۔ علامہ نے مدح کے لئے صفات و کردار کو موضوع بنایا ۔ دربار میں شہزادی زینبؑ کے مصائب پر جو نوحہ کہا ہے اس کے شعر ملاحظہ کریں ۔

کربلا میں نذر دو بیٹے دیئے جس ہاتھ نے
اس میں تھراہٹ کہاں مجمع ہے تھرایا ہوا
ظلم و بدعت کی رسن جس ہاتھ کو جکڑی رہی
دست قدرت کی طرح ذہنوں پہ وہ چھایا رہا

انصاران حسینؑ کے مصائب پر لکھے ہوئے اپنے معرکتہ الارا نوحے میں فرماتے ہیں

اے خدا کے بندوں میں منتخب خدا والو
تخت انماوالو تاج ہل اتی والو

شانِ مطصفے والو وضعِ مرتضیٰ والو
کیا وفا پہ جانیں دیں تم نے اے وفاوالو
ہائے کربلاوالو ہائے کربلاوالو

مدح امام حسین نوحہ میں ملاحظہ ہو

بھر دیا جوشِ عمل اسلام کی تلوار میں
یا حسین ابن علی کا شور ہے جھنکار میں
فاطمہ کی گود کا پالا جگا کر قوم کو
سو رہا ہے کربلا کی منزلِ بیدار میں

دوسرے نوحے میں فرماتے ہیں۔

جانِ کربلا تو نے راہ حق دکھا دی ہے
موت کے اندھیرے میں شمع سی جلا دی ہے
رحم کھاکے دشمن پر ہاتھ روکنے والے
ہائے کس قیامت کی قوت ارادی ہے

حضرت علیؑ اصغر کے حال کے نوحے میں مدح کے تیور دیکھئے۔

اے معرکہ قوت اسلام کے جوہر
چھ ماہ کی مدت میں قیامت کے برابر
ننھے سے مجاہد علی اصغر علی اصغر
آنکھوں میں جھلکتا ہوا معصوم تبسم
گردن سے ٹپکتا ہوا خونِ دلِ مادر
ننھے سے مجاہد علی اصغر علی اصغر

علامہ نجم افندی نے نوحے اور سلام دونوں اصناف سخن میں بڑے کامیاب تجربے کئے
رثائیہ شاعری میں غزل کے لفظیات اور محبوب کے سراپا کھینچنے کے انداز کو علامہ نے بنڈ

کامیابی کے ساتھ اپنے نوحوں میں استعمال کیا۔ حضرت علی اکبرؑ کے نوحے کا یہ بند ملاحظہ کیجئے فرماتے ہیں۔

تجھے تو یاد ہی ہونگے وہ لہراتے ہوئے گیسو
وغا میں ماں کی الفت یاد دلواتے ہوئے گیسو
فلک قابل مٹانے کہ نہ تھی تصویر اکبر کی
علیؑ کا نام، سن زہراؑ کا اور صورت پیمبرؐ کی

حضرت ابوالفضل العباس کی مدح کا یہ شعر سنیئے

شیر سے بپھرے ہوئے جاتے ہیں دریا کی طرف
دوش پر بکھری ہوئی زلفِ معنبر دیکھنا

حضرت قاسم کا سراپا ملاحظہ فرمائے۔

کیا اسی وقت موت آنی تھی — ادھ کھلا پھول زندگانی تھی
کچھ لڑکپن تھا کچھ جوانی تھی — اے جواں مرگ خوش نوا قاسم

ہائے پامال کربلا قاسمؑ

حُسنِ صورت پہ دو جہاں صدقے — تیکھی چتون پہ بجلیاں صدقے
موت پر عمر جاوداں صدقے — جسنے دولہا بنا دیا صدقے

ہائے پامال کربلا قاسمؑ

علامہ نجم افندی شاعر اہلبیت کہلاتے تھے۔ اپنی فکر و جذبے کے ساتھ ساتھ علامہ نے اپنی زندگی کو بھی یوں سنوارا نکھارا کہ علامہ کیساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ان سے ملنے جلنے والے یہ تصور لیکر انکی بزم سے اٹھتے تھے کہ محبت اہلبیت اور اسوہ شبیری جنکی زندگی کا فلسفہ اور جنکی حیات کا مقصد ہوتا ہے وہ کردار کی بلندیوں پر فائز ہوتے ہیں۔ صبر و شکر، عزت نفس، آزادی فکر، علم و حکمت سے لگاؤ، رہن سہن میں سادگی، محبت و شفقت، حق پر سب کچھ لٹا دینے کی ہمت، علامہ کی شخصیت میں گویا رس بس گئی تھی۔ انھیں یہ سب کچھ درِ اہلبیت سے ملا تھا۔ اسی

لئے انہوں نے اپنی شاعری میں چاہے وہ کسی بھی صنف میں رہی ہو اسکا کھل کر اقرار کیا ہے۔ انکی زندگی کا مشن ہی پیغام اہلبیت کی تشہیر تھا، اسلئے انہوں نے انسانی اقدار کو اس انداز سے نظم کیا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کو انہیں اپنانے کی ترغیب ہو سکے۔ جذبے انسانیت کے حصول کی ترغیب ملاحظہ ہو۔

لمان بن گئے ہیں انسان ہوں تو ایسے
انسانیت کی خاطر تلواریں کھا رہے ہیں
تاحشر درس دیں گے دنیا میں آنے والے
ایسا پیام دے کر دنیا سے جا رہے ہے

اسی مضمون کا دوسرا بند سلام آخر کے نوحے میں یوں ہے۔

مصلح اعظم تیرا احسان ہے کل اقوام پر
تو نے اپنا سر دیا انسانیت کے نام پر
آج ہے اقطاع عالم پر جہاں بانی تری
اب پرستش کر رہی ہے نوع انسانی تری

ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دینے کا سبق درس گاہ کربلا کی دین ہے۔ علامہ نے اسے یوں نظم کیا ہے۔

میدان کربلا کو اپنا لہو پلا کر
دنیا میں حریت کا مرکز بنا رہے ہیں
ذلت کی زندگی سے عزت کی موت اچھی
الفاظ ہیں کہ ساری دنیا پہ چھا رہے ہیں

سلام کا یہ شعر بھی اسی معنیٰ کا ہے۔

کتنی مہنگی ملے دریغ نہ کر
پھر بھی عزت کی موت سستی ہے

امام حسینؑ کا عالم انسانیت پر یہ احسان عظیم ہے کہ حضرت حسین ابن علی نے جبر و تشدد و سطوت و حکومت کے آگے سر نہ جھکایا۔ قربانی دی اور اسلام کے آئین کو بچالیا۔ علامہ نے اسے یوں نظم فرمایا ہے۔

خون کے دھاروں سے ایوانِ حکومت ڈھا دیئے
حق کی قرباں گاہ پر کتنے گلے کٹوا دیئے
جرم کہلانے کو سرمایہ پرستی رہ گئی
مٹ گئی قاتل کی ہستی تیری ہستی رہ گئی

بیسوی صدی دنیا کے محنت کشوں، مزدوروں کی جدوجہد کا باب ہے دولت اور اسباب معیشت پر قابو پاکر چند مٹھی بھر افراد نے دنیا کے ہر ملک کے افراد کے درمیان دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ یہ تاریخ کا عجیب سانحہ ہے کہ مسلم مملکتوں میں بھی انسان اور انسان کے درمیان، قوم، نسب، قبیلے، دولت اور حکومت کی اساس پر فرق کیا جانے لگا تھا۔ اسی لئے اس دور کے صاحبان فکر و نظر نے اسکے خلاف جدوجہد کی علامہ نے بھی اس جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا لیکن انکا کمال یہ تھا کہ یہ پیام بھی انہوں نے مدح اہلبیت ہی کے ضمن میں دیا۔ نوحے کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

دنیا جو روا دار نہیں جی نہ کڑھاو
انکھیں ہیں یہاں فرش کہیں دور نہ جاو
اے ھند کے مزدورو سپوتو ادھر آو
مظلوم ہو مظلوم سے دل اپنا لگاو
سب غم ہیں دو روزہ غمِ شبیرؑ وہی ہے
تیرہ سو برس بعد بھی تاثیر وہی ہے
یاں نام کی ہے شرط نہ قصہ ہے نسب کا
تنہا وہ عجم کا ہے نہ تنہا وہ عرب کا

ہندو ہوں کہ مسلم ہوں وہ غمخوار ہے سب کا
ہوتا ہے اسے درد غریبوں کی تعب کا
سب غم ہیں دو روزہ غم شبیر وہی ہے
تیرہ سو برس بعد بھی تاثیر وہی ہے

ظلم و استبداد اور خاص طور پر امپریل ازم کے خلاف جب ہندوستان میں دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح آزادی کا آغاز ہوا تو علامہ نے اسمیں کھل کر حصہ لیا۔ علامہ کے اس دور کا کلام دستیاب نہیں ہے جد وجہد آزادی میں آزادی کے متعلق انہوں نے بہت ساری نظمیں کہیں تھیں لیکن وہ نہ مل سکیں لیکن علامہ کے مذہبی کلام میں بھی علامہ کا درس آزادی ملتا ہے فرماتے ہیں۔

حسین ابن علی کے در سے پایادرس آزادی
دعا دیتے ہوئے اس در کو تیرہ سو برس گزرے
ابھی بڑھتا نہیں دل پائے نافرماں نہیں اٹھتے
نشان کھینچے ہوئے رہبر کو تیرہ سو برس گزرے

یا پھر علامہ کے سلام کے یہ شعر۔

چاند نے زہراؑ کے مستقبل درخشاں کردیا
قومیت کی روح آزادی کو جولاں کردیا
حسین ابن علی نے فطرت انساں کو چمکایا
زمانہ بے خبر تھا ورنہ آزادی کے جوہر سے
تیمور کہن نے جسم گھلا بھی دیا تو کیا
آزادی خیال کے تیور جواں رہے

علامہ کی رثائیہ شاعری خاص طور پر علامہ کے نوحوں پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ

نوحے نہیں بلکہ نظمیں ہیں جنھیں نوحوں کیطرح پڑھا جاتا ہے۔ یہ اعتراض بذات خود بے معنی ہے اور عموماً ان اصحاب کی طرف سے کیا جاتا ہے جو شعری روایات کی کھینچی ہوئی لکیر پر بھی کسی تجربے، یا صحت مند اضافے کے قائل نہیں ہیں۔ علامہ نے نوحے کی صنف کے وصف کو جوں کا توں باقی رکھا۔ گریہ ماتم کا جز علامہ کے نوحوں میں بھی موجود ہے۔ صرف یہ کہ گریہ و ماتم کے اظہار کو علامہ نے نیا رخ دیا۔ بین کے بدلے علامہ نے گریہ و ماتم کے لئے منظر کشی اور مقتل کی صحیح روایات کو نظم کیا۔ اگر ممبر سے خطیب انکے بیان سے گریہ کرا سکتا ہے اور اس پر اعتراض کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا تو پھر انہیں شعر کا روپ دیا جائے تو ان اشعار پر اعتراض بے معنی ہے۔ اگر منبر کا خطیب شہادت کی روایات پڑھکر مورد الزام نہیں ٹھرتا تو شاعر اسے نوحے میں نظم کر دے تو اس پر اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ نے جس طرز کو اپنایا وہ زیادہ بہتر تھا۔ اور اسی میں علامہ نے اپنے فکر و فن سے گریہ و ماتم کو سمو دیا۔ حضرت عباسؑ کے نوحے میں منظر نگاری ملاحظہ فرمائے۔ جسے پڑھ کر پڑھنے والے کا کلیجہ پانی ہو جاتا ہے:۔

مشک بھر کر نہر سے باہر نکلنا تشنہ لب
خیمۂ شبیرؑ کی جانب وہ مڑکر دیکھنا
دیکھکر چہرے تصور میں وہ مرجھائے ہوئے
دور تک پھیلی ہوئی پانی کی چادر دیکھنا

یا قتل امام حسین علیہ السلام کا یہ منظر

مقتل میں غش ہیں شبیرؑ تنہا
قاتل کھڑے ہیں خاموش یکجا
حیرت میں گردوں سکتے میں صحرا
ساکت ہیں موجیں ساکن ہے دریا
سورج کا چہرہ ، اترا ہوا ہے

شام غریباں کا یہ منظر کتنا پرسوز ہے

عاشور کی وہ شام وہ رن بولتا ہوا
غم کا وہ کائنات پہ پردہ پڑا ہوا
لمان کی جان خاک پہ بے گور و بے کفن
انسانیت کا شرم سے چہرہ چھپا ہوا
تہذیب لاش اصغر ناداں پہ نوحہ گر
اخلاق کی نگاہ سے عالم گرا ہوا

ایسے جانے کتنے شعر ہیں بلکہ یوں ہے کہ کوئی نوحہ یا سلام ایسا ہے ہی نہیں جسمیں گریہ و ماتم کا جز شامل نہ ہو۔ البتہ علامہ کے پاس وہ روایتی انداز نہیں ملتا ہے جسے عہد قدیم کے شعراء نے اپنایا تھا۔ علامہ نے نوحے کو نوحہ سلام کو سلام باقی رکھتے ہوئے ان اصناف کو دل کھولکر نوازا۔ زبان کا لطف جو سلام اور نوحے کی شاعری میں قال قال ملتا تھا۔ علامہ کے پاس جگہ جگہ ملتا ہے مثلاً یہ شعر سنیئے۔

تشنہ لبوں کے خون کی ندی چڑھی ہوئی
پانی لب فرات سے منہ موڑتا ہوا
یہ کن پیاسوں کے سجدے ہیں کہ دنیا تھرتھراتی ہے
زمینِ کربلا پیشانیوں سے لپٹی جاتی ہے
زندگی کی گود میں وہ اضطراب کائینات
بن گئی بے شیر کا جھولا شب عاشور کو
کیا پھول سے دلوں کو پتھر بنا لیا ہے
تلواریں کھا رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
شمع لیکر روئے اکبرؑ دیکھنے بیٹھی تھی ماں
صبح محشر تک ٹھہرنا تھا شب عاشور کو

علامہ کا مقام شعراء کے درمیان عظیم بھی ہے اور قابل قدر بھی جسے ادب کے صاحبان فکر و نظر نے مانا بھی ہے اور زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جائیگا۔ علامہ کے فکر و فن کے سمجھنے کی کوششیں ویسے ویسے تیز ہوتی جائیں گی۔ علامہ کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ علامہ نے نہ صرف شاعری کو نوازا بلکہ اپنے حلقۂ تلامیذہ میں شامل ہونے والے شعرا کی ذہنی تربیت بھی کی۔ انہیں فکر و فن سے نواز کر اس راہ کا راہی بنایا جو علامہ کی اپنی دریافت تھی۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی شاعری میں نجمیت مسلم ہو گی۔

علامہ آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن علامہ کے ممتاز تلامذہ، قائم جعفری، راحت عزمی، خورشید جنیدی ابراہیم حامی اور خاص طور پر علامہ کے فرزند علامہ سہیل افندی اب بھی اس چراغ کو جلائے ہوئے ہیں جسکی روشنی میں مستقبل کے آنے والے شعراء اپنا راستہ پائیں گے

علامہ نجم آفندی کی شاعری میں انسانی اقدار کا تصور

شاعر اپنے جسم کے مادی قیود میں محتاج سماج ہوتا ہے۔ وہ اوروں کی طرح ہر نشیب و فراز سے گذرتا ہوا وقت کے بے رحم طوفانوں سے ٹکراتا، جذبوں کی آندھیوں میں گرتا سنبھلتا زندگی کی شاہراہ پر گامزن رہتا ہے۔ ایک عام آدمی اور شاعر کے درمیان جو واضح فرق ہوتا ہے وہ فکر کی گہرائی، نظر کی دور بینی اور احساس کی شدت سے عبارت ہے جسے عام نظر دیکھ نہ پائے اسے شاعر کی نگاہ دیکھ پاتی ہے۔ حال کی آواز سے مستقبل میں ہونیوالے ارتعاش کو شاعر کا احساس لفظوں کے دامن میں محفوظ کر دیتا ہے لیکن یہ تعریف شاعر کی ہے جو یقیناً Creater ہوتا ہے۔ وہ لفظوں کا سہارا لیکر نئے خیال نئی فکر اور نئے ماحول کو پیدا کرتا ہے اگر اس میں تخلیق کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ شاعر نما ہو سکتا ہے شاعر نہیں۔

شاعری حساس دل اور روشن دماغ کا منصب ہے۔ شاعر کے لئے کائنات کا ہر درد اس کا اپنا درد ہوتا ہے لیکن اردو شاعری اس مرکز کے اطراف دو ہم مرکز دائرے بناتی ہے۔ ایک دائرے میں شاعر کے اپنے مسائل محبوس ہوتے ہیں تو دوسرے میں سماج کے تقاضے۔ ان دائروں کی مضبوط بنیادوں پر شاعر اپنے تصور کی کائنات بناتا ہے۔ شاعر کے لئے آئیڈیالوجی کی اہمیت بحث سے مبرا ہے۔ ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شاعر اپنی منزل اور جادہ کا یقین کئے بغیر رواں دواں ہو۔ اب یہ اس کی فکر اور صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے پیغام کی حدوں میں ایک مخصوص گروہ کو لے آئے یا اس کا پیغام کائنات کے سارے انسانوں کے لئے ہو۔ عام طور پر بلکہ اکثریوں ہوتا ہے کہ شاعر اظہار خیال کے لئے جن (Symbols) کو منتخب کرتا ہے یا جس کینوس پر اس کے خیال کے نقوش ابھرتے ہیں اسی کے سہارے اس کے پیغام کا دائرہ بھی معین کیا جاتا ہے۔ لیکن جائزہ لینے کا یہ طریقہ صحت مند بنیاد کے منافی ہے۔ عام طور پر

شاعری میں اور خاص طور پر اردو شاعری میں یہ علامتیں اتنی محدود تعداد میں ملتی ہیں کہ رواروی میں پڑھے جانے والے اشعار کی بڑی تعداد کا مطلب ایک محدود دائرے سے باہر نکلتا نظر نہیں آتا لیکن اگر تھم تھم کر لفظوں کی گہرائی کا جائزہ لیا جائے تو اکثر یہ محدود دائرے میں مقید اشعار اپنی وسعت کے اعتبار سے کائنات پر محیط ملتے ہیں۔ یہ اردو ادب کا بڑا المیہ ہے کہ اسکے صاحب قدر نقادوں نے ان شعراء پر خاطر خواہ توجہ نہ کی جنھوں نے اپنے نظریہ حیات کو مذہب کی بنیادوں پر لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مذہب اور خاص طور سے مذہب اسلام کائنات کے سارے انسانوں کے لئے زندگی کے صحیح اور ستھرے اقدار کا نظام ہے پھر اگر کوئی شاعر اسلام کے قانون پر انسانی اقدار کی بنیاد رکھے اور صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لئے اسلام کی قدروں کو اجاگر کرے تو اس کی شاعری کو محدود اور اس کی فکر کو محیط کہنا یقیناً درست نہیں ہے۔ یہ بڑی عجیب اور دلچسپ حقیقت ہے کہ شعراء کی ایک بڑی تعداد جن کی شاعری اسلام سے ہٹ کر کسی آئیڈیالوجی مثلاً کمیونزم کو اساس بناتی ہے اردو ادب کے نقادوں کی نظر میں نہ تنگ نظر کہلاتے ہیں اور نہ ان پر تعصب پسندی کا الزام رکھا جاتا ہے۔

انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ان شعراء کے کلام کا جائزہ جن کا کینوس اسلام اور جن کا (Ideal) رسولؐ اور اہلبیتؑ رسول ہیں۔ وسعت نظری اور ذہنی تعصب سے ہٹ کر لیا جائے۔

علامہ نجم آفندی ایسے شعراء کی فہرست کے اس شاعر کا نام ہے جس کی شاعری آفاقی روایات، انسان دوستی رواداری، حق پسندی عزت نفس، مساوات اور علم دوستی سے عبارت ہے۔ علامہ نے انسانی اقدار کے اظہار کے لئے اسلام اور عظمت اسلام کو اپنایا۔ رسولؐ اور اہلبیتؑ رسول کی مدح سرائی کی لیکن علامہ کی عظمت یہ ہے کہ علامہ نے اپنی شاعری میں انسانی اقدار کو بڑی فیاضی کے ساتھ پیش کیا۔

علامہ کے لئے مسلمان، انسان کا سمبل تھا اور اسلام اس قانون کا نام جس پر کاربند ہو کر انسانی سماج کی بنیاد انسانی اقدار پر ممکن تھی۔ علامہ نے رسولؐ اور اہلبیتؑ رسول کی مدح میں بے حساب شعر کہے۔ منقبتیں، قصیدے، نوحے، سلام اور مرثیے۔ ہر صنف میں علامہ کو کمال

حاصل تھا، لیکن ان کی مدح کا انداز عام روش سے جداگانہ تھا۔ انہوں نے صفات رسولؐ وآل رسولؐ کی مدح سرائی کی۔ ان اصولوں کو اجاگر کیا جو انسانیت کے لئے مشعل راہ بن سکتے تھے۔ علامہ کا اعزاز یہ ہے کہ اس راستے پر علامہ کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے علامہ نے اپنی آئیڈیالوجی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں کی۔

کتنی مہنگی ملے دریغ نہ کر
پھر بھی عزت کی موت سستی ہے
آزاد کو ایک قید ہے مغفوری بھی
ہے بارِ گراں قبائے دستوری بھی
تو اپنی جگہہ معین کر لے
دنیا میں غلامی بھی ہے مزدوری بھی
بزمِ امکاں میں کہاں سادگی قول و عمل
ایک ذرہ نہیں محفوظ اداکاری سے

عزت نفس اور خودداری پر اڑے رہنا اسوقت بہت مشکل ہو جاتا ہے جب انسان کے سامنے دولت، حکومت اور شہرت کے مقام آتے ہیں۔ جانے کتنے ہیں جنھیں دنیا کی نظروں نے بکتے دیکھا ہے۔ ٹوٹتے پایا ہے اور پگھلتے محسوس کیا ہے لیکن کہیں کہیں کبھی کبھی وہ لوگ بھی مل جاتے ہیں جن کے قدم ہر امتحان کی راہ سے مضبوطی کے ساتھ گذر جاتے ہیں۔ علامہ کی زندگی میں جانے ایسے مقام کتنی بار آئے۔ صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کروں جسے علامہ نے اپنے ایک خط میں تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"میں نے اپنی جوبلی کے متعلق ہندوستان اور پاکستان کی دو تحریکوں کی مخالفت کی بمبئی کے حضرات ہزارہا روپئے کی تھیلی دے رہے تھے ۔ بچاسی ہزار تک نوبت آگئی تھی مگر میں نے منظور نہیں کیا"

یہ شان اس شاعر کی تھی جس نے خود ہی

لکھا تھا شاعر ہوں مجھے ملا ہے شاعر کا نصیب
دوری ہے مسرت سے بہت غم سے قریب
میرے لئے آرام کہاں دنیا میں مسجد کا امام
ہوں نہ منبر کا خطیب

انسانی اقدار کی فہرست میں جس قدر انسانی پر آج دنیا کی تہذیب استادہ ہے وہ انسانی مساوات ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ Social Justice کا تصور سب سے پہلے واضح طور پر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ خود مسلم مملکتوں میں رہنے بسنے والے مسلمانوں نے بھی سماج میں انسانوں کے درمیان غریبی اور امیری کی دیواریں کھڑی کر دیں یہ عام طور پر عالمی انقلابات کے دور کی وہ لعنت تھی جس نے سوچتے دماغوں کو جھنجوڑا اور حساس دلوں میں آگ بھر دی۔ علامہ کا تصور مساوات انسانی اسلام میں پیش کئے گئے اصولوں کی بنیاد پر بڑا واضح ہے۔

عالم میں بے مثال تھی یہ کربلا کی جنگ
یکساں دغا کی بندہ و آقا کو تھی امنگ
کچھ سن کا امتیاز نہ تفریق نسل و رنگ
حق کی صدائے عام تھی میدان تھا نہ تنگ
ہر باوفا حسینؑ کے قدموں پہ سو گیا
سنا کر نجم قصہ کربلا والے شہیدوں کا
مسلمانوں کو سمجھا دو مسلماں ایسے ہوتے ہیں
بنی آدم ہیں سب لیکن یہ کیسی آدمیت ہے
فسادوں کے لئے دو دن کی دنیا میں بھی فرصت ہے۔

شاعر کا حساس دل سماج میں کھینچے ہوئے ان بے معنیٰ خطوط پر تڑپ اٹھتا ہے جہاں امیری غریبی کا فرق لعنت بن کر ملتا ہے۔ علامہ کی شاعری میں کئی ایسے شعر ملتے ہیں جہاں ان کا

لہجہ طنز کے تیر برساتا اور لفظ شعلے برساتے لگتے ہیں۔

اے لذت ہلِ اتٰی میں کھونے والے
اسلاف سلف پہ شاد ہونے والے
فاقے سے ہیں دن بھر کے پڑوسی کتنے
اے رات کو پیٹ بھر کے سونے والے
خدمت میں جو وارد ہو کوئی صاحب دولت
تعظیم کو بڑھتا ہے عمامہ بھی عبا بھی
تعظیم کا کیا ذکر ہے پہلو بھی نہ بدلیں
آجائے اگر صورت مفلس میں خدا بھی

علامہ نجم آفندی کی شاعری کا ابتدائی زمانہ ہندوستان کے اس دور کا ہے جب ہندوستان اپنی آزادی کی لڑائی میں مصروف تھا۔ اس تحریک کا اثر اس دور کے ادب پر بڑا گہرا ہے۔ ہر ادیب، شاعر اور مفکر نے آزادی کی جدوجہد میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ علامہ کیلئے یہ عنوان بڑا مشکل تھا۔ مذہب کے دائرے میں آزادی کا تصور پیش کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا اسلئے کہ اسلام میں عمل کی آزادی مرضی پروردگار کے حدود میں ہے۔ علامہ نے کربلا کی جنگ اور حسینؑ کے عمل کو بنیاد بنا کر تصور آزادی کو پیش کیا۔

حسین ابن علی کے در سے پایا درس آزادی
دعا دیتے ہوئے اس در کو تیرہ سو برس گذرے
ابھی بڑھتا نہیں دل پائے نا فرماں نہیں اٹھتے
نشاں کھینچے ہوئے رہبر کو تیرہ سو برس گذرے
چاند نے زہرا کے مستقبل درخشاں کردیا
قومیت کی روح آزادی کو جولاں کردیا
حسین ابن علیؑ نے فطرت انسان کو چمکایا

زمانہ بے خبر تھا ورنہ آزادی کے جوہر سے
قیدِ کہن نے جسم کھلا بھی دیا تو کیا
آزادی خیال کے تیور جواں رہے

علامہ کے لئے شاعری سیاسی نعرے بازی یا شہرت کے حصول کا ذریعہ نہیں تھی۔ علامہ نے بھی مزدور کی عزت اور جمہوریت کے اقدار نظم فرمائے لیکن عام روش سے ہٹ کر انکی نظروں میں مزدور اس جفاکش کا نام تھا جو قابل تعظیم و لائق تحسین ہے دنیا کے سامنے رسولؐ اور آل رسولؑ کی زندگی اور صاحب اختیار رہ کر مزدوری کو اپنا شعار بنانے کے اصول کو رکھ کر علامہ نے مزدور اور مزدوری کی اہمیت سمجھائی۔

اسلام کا یہ نظام دستوری دیکھ
یہ عہد قدیم طرز جمہوری دیکھ
ہے آج کی اشتراکیت پر نازاں
سلماںؓ کی گورنری اور مزدوری دیکھ
اے عزت و اقتدار ظاہر کے غلام
نسبت ہے تجھے علیؑ سے بے شک لا ریب
کس فخر سے ذکر اس کی مزدوری کا
اس کے لئے فخر اور تیرے لئے عیب
اے دامن دولت و امارت کے پلے
زیبا ہے اگر غریبوں سے بچ کے چلے
مزدور کی ہیں منتشر آہیں جس میں
جب جانیں کہ اس فضا میں سانس نہ لے

علامہ کی شاعری کی سب سے اہم علامت مسلمان ہے۔ مسلمان علامہ کی نظر میں وہ ہے جو انسان ہو، مکمل انسان صاحب علم و عمل، وفا پرست، وسیع النظر، حق پسند، بہادر،

خوددار، اور آزادیٔ عمل کا متوالا۔ وہ مسلمانوں کو انسانی اقدار کا علمبردار سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے جب جہاں کہیں بھی مسلمانوں کو قدر انسانی سے گرتے ہوئے دیکھا انکا لہجہ تیز اور ان کے اشعار شعلے بن گئے۔ انہوں نے تعلیمات نبی اور آلِ نبی کو لفظوں کے دامن میں سمیٹ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔

احساس حیات کو جگانے والا
حکمت کے حدود کو بڑھانے والا
کتنے پیغمبروں کے بعد آیا ہے
انسان کو انسان بنانے والا
رکھی تھی ظالموں نے مٹانے میں کیا کسر
انسانیت حسینؑ کے صدقے میں رہ گئی
چار لفظوں میں ہے یہ اسوہ انصارِ حسینؑ
وسعت فکر و نظر، حوصلہ عزم و عمل
سرمایہ پرستوں کی خوشامد میں نہ رہ
دولت کو دعا دے نہ گداگر کی طرح
ہشیار تو لیتے نہیں قرآں سے سبق
بے ہوش کو قرآں کی ہوا دیتے ہیں

علامہ کے لئے شاعری کبھی نہ پیٹ بھرنے کا ذریعہ رہی نہ سستی شہرت کے حصول کا ان کی شاعری ایک ایسے فنکار کی آواز ہے جو زبان سے نہیں دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہو۔ وہ شاعر اہلبیت کہلاتے تھے اور زندگی بھر اپنے اس اعزاز کی لاج رکھی، لیکن ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں آفاقی اقدار مزدور کا وقار دستوری نظام حکومت اور جمہوریت کے انداز بھی ملتے ہیں

(سیمنار۔ اردو مجلس حیدرآباد)

میر کاروان دکھن

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

انسان فنا کی منزل کا مسافر زندگی کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ زندگی کے نام پر عطا کی گئی سانسوں کے سہارے وہ دنیا کی تاریک راہوں پر اپنی محدود فکر کے سہارے سفر کرتا ہے جو تغیرات انقلابات اور روایت کے سانچوں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا مادی وجود اسے دنیا کی آسائشوں کی طرف کھینچتا ہے اور فکر اسے ان راستوں کا پتہ دیتی ہے جن پر زمان و مکان کی قید نہیں ہوتی۔ اگر اس کی فکر بیدار اور دماغ روشن ہو تو وہ اپنی منزل فنا پر پہنچ کر بھی فنا نہیں ہوتا۔ وہ جسم کے قید و بند سے آزاد ہو کر اس کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنے والوں کے ذہنوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ نہ ہر انسان کا مقدر ہے اور نہ عام طور پر ہوتا ہے لیکن برسوں اور صدیوں میں کچھ ایسے انسان ضرور پیدا ہوتے ہیں جن کی حیات انسانی ذہن کی بقا کیساتھ مربوط ہو جاتی ہے۔ یہ ہماری طرح کے جیتے جاگتے، کھاتے پیتے اور زندگی کی عام مصروفیات میں مشغول انسان دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی عظمت یہ ہوتی ہے کہ وہ فرد نہیں بلکہ اپنے آپ میں ایک انجمن ہوتے ہیں۔ یہ اپنے راستوں پر چلنے والوں کے ذہنوں کی تربیت کرتے ہیں۔ انھیں راستہ دکھاتے ہیں اور اس راستے پر ان کی رہبری کا فرض پورا کرتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کی رہنمائی میں پلنے بڑھنے والے دماغ یوں تربیت پا جاتے ہیں کہ ان کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ اپنے رہبر سے لمحہ لمحہ اور پل پل ملتا ہے۔ میرے خیال میں کسی فرد کی عظمت کا اطلاق اس اصول پر ہونا چاہیئے کہ اسنے سماج کو کیا دیا۔ اس کے بتائے ہوئے راستے کہاں تک وسعت پائے اور ان پر چلنے والوں کی فکر و نظر نے اسکے جلائے ہوئے چراغوں سے کتنی روشنی مستعار لی۔

اسنے اپنی زندگی میں ان شاہراہوں سے کتنا گریز کیا جن پر عوام کے قدموں کے نقوش نمایاں ہیں ۔ شہرت، دولت اور حکومت کے شکنجوں سے اس کا فاصلہ کیا رہا ۔ اس کی طبعی زندگی اور اس کی فکر و دانش کی کاوشوں کا تناسب کیا تھا۔

اور اگر پھر یوں ہو کہ جس کو دیکھا، پرکھا اور پڑھا جارہا ہے ۔ وہ فرد اپنے ہی میں انجمن ہو ۔ اپنے آپ میں اس کی قوت جاذبہ اتنی شدید ہو کہ اس کے دائرہ اثر میں آنیوالی ہر شئے خود بھی جاذب دکھائی دینے لگے ۔ وہ روایت کے احترام تک ان ذہنوں کی تربیت کرے جو ابھی منزل سفر میں ہوں ۔ وہ ایک شمع کی مانند لگے جو خود جلتی رہے لیکن اندھیرے راستوں کے راہی کو روشنی عطا کرے ۔ اسکے آگے عزت، دولت اور حکومت کے پر کشش مقام ہوں لیکن وہ انھیں ٹھکرا کر آگے بڑھ جائے تو میں ایسے انسان کو عظیم بھی کہوں گا اور لافانی بھی ۔

میرے ذہن میں ایسے انسانوں کی جو فہرست مرتب ہے ان میں کا ایک نام ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ہے ۔ زور پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ عطیہ رومانی کے مقالے کا عنوان ہے ۔ ڈاکٹر زور شخصیت اور کارنامے ۔ مقالہ زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے ۔ اس کے علاوہ بہت سارے مضامین میں سے چند ایک یہ ہیں ۔ ڈاکٹر زور مرحوم، ڈاکٹر ایس ۔ آر کلکرنی، تاریخ اردو میں ڈاکٹر زور کی شخصیت کا تعین ۔ ضیاء الدین شکیب، سید محی الدین قادری زور کی اہم شخصیت، ڈاکٹر انور معظم ۔ ڈاکٹر زور اردو کے عظیم خدمتگذار، پنڈت ونشی دھر ودیالنکار ڈاکٹر زور ۔ ڈاکٹر عمر خالدی، ڈاکٹر زور کے ادبی خدمات ۔ ایس صلاح ۔ لیکن آپ یقین جانئے ڈاکٹر زور پر اتنا ہی اور لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جائے گا ۔ مجھے اپنے مضمون میں ان تذکروں کو نہیں دھرانا ہے جو لکھے جا چکے ہیں ۔ میں انھیں آپ کی یادداشت تازہ کرنے کے لئے صرف گنتا چلا جاؤنگا ۔

زور صاحب کے ابتدائی دو نیم تاریخی افسانے طلسم تقدیر اور فسانہ تازیانہ تھے طلسم تقدیر سنہ ۱۹۱۵ ۔ میں کتابی صورت میں شائع ہوا ۔ بی ۔ اے کی تعلیم کے دوران زور صاحب کی

وہ تصنیف شائع ہوئی جس نے زور صاحب کو دنیائے ادب میں متعارف کروایا۔ روح تنقید کو عبدالحلیم شرر، نیاز فتح پوری، پروفیسر محمود شیروانی، سرراس مسعود اور عظمت اللہ خان نے سراہایا۔ اگر زور صاحب اپنی زندگی میں کچھ نہ لکھتے بھی تو ان کی عظمت کے لئے اتنا کافی تھا کہ بی اے کے ایک طالبعلم نے اردو کے اس دور کے صاحبان فکر کو اپنی کتاب پر رائے زنی کرنے پر مائل کیا۔

مجلہ عثمانیہ کے پہلے مدیر کی حیثیت سے زور صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو ادب کی لاثانی خدمات کا سنگ بنیاد رکھا۔

پھر زور صاحب کی تین کتابیں تنقیدی مقالات، محمود غزنوی کی بزم ادب اور تین شاعر یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔

سنہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۹ء تک زور صاحب یورپ میں رہے اور ہندوستانی صوتیات پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یورپ سے واپس ہوتے ہی "اردو شہ پارے" شائع کی۔ ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی۔ ان تصانیف کے علاوہ ۱۹۴۵ء تک ڈاکٹر صاحب کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں۔ (۱) قصص خوب رنگ۔ (۲) عہد عثمانی میں اردو کی ترقی (۳) گلزار ابراہیم (۴) جواہر سخن (۵) فن انشاء پردازی (۶) مرقع سخن (۷) متاع سخن (۸) کیف سخن (۹) بادہ سخن (۱۰) سیر گولکنڈہ (۱۱) فیض سخن (۱۲) محرم نامہ (۱۳) روح غالب (۱۴) سرگزشت غالب (۱۵) مکتوبات شاد عظیم آبادی (۱۶) اردو کے اسالیب بیان (۱۷) سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۸) کلیات محمد قلی قطب شاہ (۱۹) گارسان دتاسی (۲۰) تاریخ ادب اردو (۲۱) میر محمد مومن۔

زور صاحب کی زندگی کا یہ ایک رخ ہے۔ دوسرے رخ پر زور صاحب کی تنظیمی اور عملی کاوشوں کی اتنی ہی ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں سرفہرست ادارہ ادبیات اردو اور ایوان اردو کی تعمیر و ترقی کی تاریخ لکھی ہے۔

کسی بھی فرد کو ذہن انسانی میں زندہ رہنے کے لئے اتنا کچھ کافی ہے لیکن مجھے زور صاحب کے عمل سے نہیں روح عمل سے دلچسپی ہے۔ عمل اس وقت شرف پاتا ہے جب محرک عمل صحت مند ہو یہ اردو ادب کے صاب نظر نقادوں کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ جب کبھی کسی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی نظریں نظموں کا سینہ چاک کر کے ان جذبوں تک نہیں پہنچ پاتیں جو فنکار کی روح سے عبارت ہوتے ہیں۔ فن جب شخصیت بن جائے تو فنکار غیر فانی ہو جاتا ہے۔ فن کو شخصیت بنانے کے لئے فنکار کو جن راستوں سے گذرنا پڑتا ہے وہ طوفان کی زد پر اور آندھیوں کی گذر گاہوں کے تلے ہوتے ہیں۔ تجربوں کی تیز دھوپ سے جلتے اور ریگزاروں کی گودی سے ہوتے ہوئے چلتے ہیں۔ ان راستوں پر فنکار کا لہو بوند بوند بہتا ہے اس کی فکر ریزہ ریزہ بکھرتی ہے۔ ٹوٹتے ہوئے لمحوں کا کرب اس کی قسمت بن جاتا ہے اور پھر شخصیت فن کا پیکر دھار لیتی ہے۔ پھر اسکی آواز وقت کی سنگلاخ دیوار کا سینہ چیرتی ہوئی ان ذہنوں کو جھنجوڑ کر بیدار کرتی ہے جن کی قسمت جمود سے عبارت ہوتی ہے۔ اسی لئے کسی عظیم شخصیت کا جائزہ اس کی تخلیقات کی گنتی سے نہیں لگانا چاہیئے بلکہ اس محرک کو تلاش کیا جانا چاہیئے جو اس کی تخلیقات کے سائے میں کار فرما رہا ہو۔ زور صاحب دو ایک خصوصیات میں مجھے منفرد نظر آتے ہیں۔ انکے عمل کے تلے محرک عمل ان کا دکن کی تاریخ، تہذیب اور زبان سے بے پناہ خلوص تھا۔ انہوں نے دکن کی تہذیب کو جلادی۔ دکنی تہذیب کے خطوط کو اجاگر کیا اور دکن کے صاحبان قلم کو سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنایا۔ اردو کی تاریخ کو ان کی تصنیفات نے ایک صدی عطا کی اور اس کے دامن میں ان صاحبان کمال کی فکری کاوشوں کو جگہہ جنھیں زمانے نے ناقدری اور لاعلمی کی خاک تلے دفن کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ تنہا زور صاحب اگر کر کے گذر جاتے تو وہ انفرادیت انھیں نہیں ملتی جسے آج انکا شرف کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے اپنے اطراف صاحبان فکر و نظر کا ایک حلقہ بنایا۔ اس انجمن میں شامل کرنے کیلئے انہوں نے صاحبان فکر کو یوں چنا جیسے کوئی جوہری پتھروں کے انبار سے جواہر الگ کرتا ہے۔ ان غیر

تراشیدہ ہیروں کو انہوں نے کانٹا چھانٹا اور یوں جلادی کہ وہ دمکنے چمکنے لگے۔ زور صاحب کا یہ کارنامہ ان کی لافانی زندگی کی وجہ بنا۔ وہ اردو ادب ہو کہ ہندوستانی تاریخ آج کے محقق کے لئے دکن عنوان ہے جس پر کام کیا جاسکتا ہے۔ کام کیا گیا اور انہیں ہم دکن والوں نے فخر کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جن کی نظروں کے حدود وندھیا کی چٹانوں اور نربدا کے دھاروں سے آگے بڑھ نہیں پاتے تھے۔ جن کی نظروں میں ہندوستان کے دور وسطیٰ کی تاریخ مغلوں سے آگے نہیں تھی۔ قطب شاہیوں کو جب زور صاحب اور ان کے رفیقوں نے ماضی کے اندھیروں سے حال کی روشنی تک پہنچایا تو ان تاریخ دانوں نے آنکھیں مل مل کر انہیں دیکھا۔ وہ بے اساس نظریہ جس کے تحت دکن کی زبان اور دکن کی تہذیب کو حقیر سمجھا جاتا تھا کسی کانچ کے برتن کی طرح سطح مرتفع دکن کی سنگلاخ زمینوں پر گر کر ٹوٹ گیا۔ یہ زور صاحب کا کارنامہ تھا۔ میں تھا نہیں کہوں گا بلکہ ہے جسے دکن کا کوئی بھی انصاف پسند دماغ فراموش نہیں کر سکتا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کیوں اب تک کسی نے زور صاحب کی دکنی تاریخ کے لئے ان کی خدمات پر قلم نہیں اٹھایا۔ میں نے زور صاحب کی بہت ساری تخلیقات ایک تاریخ داں کی حیثیت سے پڑھی ہیں بلکہ ان میں سے کثرت سے حوالے دیئے ہیں۔ میں یہ بات بڑے بھروسہ سے کہونگا کہ زور صاحب ادب اور تاریخ کے سنگم کا نام تھا۔ انہوں نے دماغ ایک تاریخ داں کا پایا تھا۔ جس نے اردو ادب کو اپنایا۔ انکے پہلے دو افسانے جو نیم تاریخی ہیں میری بات کا جواز ہیں پھر ان کی اکثر تصنیفات میں ادب اور تاریخ کا باہمی ربط نمایاں ہے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ میں قلی قطب کے حالات زندگی محمد قلی قطب شاہ کی تاریخ، میر مومن، سیر گولکنڈہ وغیرہ زور صاحب کو تاریخ دانوں کے درمیان اونچا مقام دلانے کے لئے کافی سے زیادہ سرمایہ ہیں۔

زور صاحب ادارہ ادبیات کے بانی، ایوان اردو کے معمار اور سب رس کے نگران

تھے۔ یہ تو آپ سب نے بارہا پڑھا اور سنا ہوگا لیکن یہ تینوں عنوان ہیں۔ ان کے لئے جنھیں حالات کے پس منظر میں حرکات کا جائزہ لینے کا چکا ہے۔ یہ سارے کام اس دور میں ہوئے جب اردو کی تاریخ کا رخ روایت پسندی سے انحراف پسندی کی طرف تھا۔ کبھی شخصیتیں تحریک سے بنتی ہیں، اور اداروں کے سہارے پروان چڑھتی ہیں اور کبھی شخصیتیں تحریک بناتی اور اداروں کو جنم دیتی ہیں۔ پہلا راستہ وہ اپناتے ہیں جنھیں اپنی فکر اور اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی تحریک سے وابستہ ہوجاتے ہیں اور کسی ادارے کو سہارا بناکر سماج میں اپنے لئے مقام بنانے پر کوشاں رہتے ہیں۔ جس دور میں زور صاحب کا قلم قرطاس پر رواں دواں تھا۔ اس دور میں یہ راستہ کھلا ہوا بھی تھا اور آسان بھی۔ اگر زور صاحب نے اسے اپنا لیا ہوتا تو وہ اس دور میں شائد اجاگر ہوجاتے۔ انہیں شائد مرتبہ بھی ملتا، دولت بھی اور عزت بھی لیکن وہ فنکار تھے۔ انہیں راہ رو نہیں رہبر بننا تھا۔ انہوں نے یہ عام راستہ ترک کیا۔ اپنی راہ بنائی اور اس پر چل نکلے، لیکن یہ بغاوت تھی اس لئے ان کا راستہ روکا گیا۔ رجعت پسند سمجھا گیا۔ طنز کے تیر چلائے گئے لیکن زور صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اس کٹھن راستے پر تن تنہا ہی چل نکلے لیکن آہستہ آہستہ کارواں بنتا گیا۔ اس کارواں کو ادارہ ادبیات اردو کا نام دیا گیا۔ یہ آج تک باقی ہے اور جب تک باقی رہے گا زور صاحب کا نام باقی رہے گا اور ادب اور تاریخ کے صفحات پر میر کارواں کی حیثیت سے باقی رہے گا۔

(سیمنار۔ یوم زور۔ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد)

حضرت باقر امانت خانی کی مرثیہ نگاری

غم انسانی خواہشات کی دین ہوتا ہے اس لئے غم کے بغیر زندگی کا تصور محال ہے
لیکن ہر غم وقت کا اسیر ہوتا ہے ۔ جس طرح خواہشات انسانی اسے جنم دیتے ہیں اسی طر
گذرتا ہوا وقت اس کی شدت کو کم کرنے اور بعض وقت اسے بھلا دینے کا باعث بنتا ہے ۔ غم
یہ آئین انسان کے بہت سارے غموں کے لئے صحیح ہے لیکن اس فہرست میں ایک غم ایسا
ہے جس پر قید زمان و مکان نہیں ہے ۔ غم شہیدان کربلا پر نہ گذرے ہوئے وقت کا کوئی
ملتا ہے اور نہ یہ غم اسیر مکان رہا ہے بلکہ یوں ہے کہ اس غم سے ربط اہل فکر و نظر کے درمیا
حق و صداقت سے وابستگی سمجھی جاتی رہی ہے ۔ اسی وجہ سے شاعری کے وہ اصناف جو اس غم ۔
اظہار کے لئے مختص ہوگئے ہیں ہر دور اور ہر زمانے میں شعراء کی توجہ کا مرکز رہے ہیں ۔

قطب شاہوں کے شہر حیدرآباد کی فضائیں مرثیے کی ابتداء اور اس کی مسلسل تر
سے ہمیشہ سے مانوس رہی ہیں ۔ حضرت باقر امانت خوانی نے ان ہی فضاؤں میں آنکھیں کھول
۱۹/ مارچ ۱۹۰۹ء کو تولد ہوئے ۔ عالمگیر کے وزیر امانت خان سے خاندانی سلسلہ تھا ۔ اس ۔
امانت قانی کہلائے ۔ والد بزرگوار میر زین العابدین کے زیر سایہ ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی
قدرت نے باقر امانت خان کو دو صلاحیتوں سے سرفراز کیا ۔ آرٹ اور شاعری باقر نے ان
صلاحیتوں کو اپنا لہو دیا ۔ انہیں اپنے میں اتنا رچالیا کہ باقر کی شخصیت سے کسی ایک کو بھی الگ
کرنا ممکن نہیں ہے ۔ لیکن ان کی شخصیت کا اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے آرٹ کو اپنی شاعری ا
شاعری کو اپنے آرٹ میں یوں سمو دیا کہ ان کے یہ دو وصف ایک ہی مرکز کے اطراف کھ
ہوئے دو ہم مرکز دائرے بن گئے ۔ باقر امانت خانی نے اپنی ہر نعمت کا استعمال اظہار دلا ۔
اہلبیت کے لئے کیا ۔ اکیسو پچاس سے کچھ زیادہ تصویریں بنائیں ، جن میں سے اکثر مذ

موضوع پر ہیں ۔ باقر امانت خانی کو آرٹ کی دنیا نے دل کھول کے نوازا۔ ان کی پینٹنگس کو ہندوستان گیر شہرت ملی ۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے انہیں پینٹنگ میں اپنا استاد بنالیا۔ لیکن باقر امانت خانی کی شخصیت کا منفرد پہلو یہ ہے کہ ان میں آرٹ اور شاعری دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے ۔ پروفیسر عالم خوندمیری نے ان کے مرثیے ، جہاد صبر ، پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسی بات کو یوں لکھا ہے ۔ " باقر امانت خانی حیدرآباد کے شعراء میں اس لحاظ سے بھی ایک منفرد مقام کے حامل ہیں کہ ان کی فنکارانہ شخصیت مصوری کے فن لطیف اور شاعری کے فن شریف کا سنگم ہے ۔

بلند قامت، چھریرا بدن تیکھے نقوش ، سنجیدہ مزاج ۔ حضرت باقر امانت خانی حیدرآباد کی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں ۔ ۱۹۶۴ء سے اب تک باقر امانت خانی نے مدح اہلبیت و ذکر شہیدان کربلا میں (۱۵۰) قصائد ۵۰۰ سلام ، ۳۰ مرثیے ، ۲۰ قطعات اور بے شمار نوحے کہے ہیں ۔ ۸۷ برس کی عمر تھی لیکن فکر پھر بھی بیدار تھی ، مشق سخن جاری ہے ۔ ۱۹۵۵ء سے مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا تھا اب بھی جاری ہے ۔ ہر سال ۱۲/ محرم کو ایک تازہ مرثیہ گوش گذار سامعین کرتے ہیں ۔

باقر امانت خانی کے مرثیے قدیم و جدید طرز کا حسین امتزاج ہیں ۔ مرثیے کے وہ ارکان جنھیں دور قدیم کے مرثیے نگاروں نے اپنایا تھا باقر صاحب کے مرثیوں میں بھی ملتے ہیں ۔ (۱۲) مرثیوں میں ساقی نامہ نظم کیا ہے اور خوب کیا ہے ایک بند ملاحظہ کیجئے ۔

وقارِ حسنِ عمل دافع عذاب شراب
بہارِ باغِ جناں جو ہرِ ثواب شراب
سکوں شراب ہے تسکینِ اضطراب شراب
کہوں گا نزع کی حالت میں بھی شراب شراب
نہیں چھپے گی کبھی حبِ بو تراب کی بو

میرے کفن میں بھی ہوگی اسی شراب کی بو

لیکن روایت کی اس پاسداری کے باوجود باقر صاحب کے مرثیے کل کی شاعری نہیں کہے جاسکتے بلکہ ان میں وہ سب کچھ ہے جسے آج کی دنیائے ادب شاعری کا لازمہ سمجھتی ہے اپنے مرثیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے خود باقر صاحب نے لکھا ہے۔" زمانے کا رنگ بدل گیا ہے فکر ونظر کے زاویے تبدیل ہو گئے ہیں، مرثیے کا رنگ بھی ماحول کے تقاضے سے بدلنا ہوگا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرثیہ اپنے حدود کو توڑ کر آگے نکل جائے اور مرثیہ کہے جانے کا مستحق نہ ہو"۔ باقر صاحب نے اپنے سارے مرثیوں میں اپنے نظریئے کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس لئے ان کے مرثیوں کا وصف نہ نئے تجربے ہیں اور نہ مرثیے کی ہیئت میں رد و بدل بلکہ باقر کے مرثیے اس حسن سے مرصع ہیں جو ایک آرٹسٹ کا حصہ ہوتا ہے ان کے مرثیوں کی منظر نگاری خاصے کی چیز ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے باقر صاحب نے لفظوں سے تصویر بنائی ہو۔

صبح عاشورہ کا منظر ملاحظہ فرمایئے

ہر سمت چراغ اپنے بجھانے لگے جگنو — اب رم کی صفت بھول گئے دشت کے آہو

ہیں صبح کی چادر میں نہاں شام کے گیسو — سورج نہیں یہ ہے شب عاشور کا آنسو

ہر روز نظر آئے گا ہرگز نہ بہے گا

رخسار پہ ہستی کے یہ تا حشر رہے گا

چھ ماہ کے شہزادے علیؑ اصغر کی لاش ہاتھوں پہ لئے جب حسینؑ ابن علی خیمہ کے نزدیک پہنچے تو ام رباب بے چین ہو کر نکل آئیں اس منظر کو باقر صاحب نے یوں نظم کیا ہے۔

پہنچے خیمے کے قریں اپنے جو شاہ خوش خو — لاش ہاتھوں پہ تھی رنگین تھا خوں سے بازو

بولے یوں مادر اصغرؑ سے بہا کر آنسو — آب پیکاں سے ہوا سیر یہ تیرا مہ رو

ماں نے دل تھام کے آغوش میں لے لی میت

منہہ کو پھیرے ہوئے شبیرؑ نے دیدی میت

باقر صاحب کو شعر کہتے ہوئے اس کا احساس ہمیشہ ہی رہا ہے کہ وہ آرٹسٹ ہیں اسی لئے انہوں نے اپنے مرثیوں میں اپنے اس وصف کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اسی اظہار نے باقر صاحب کے مرثیوں کو انفرادیت دی ہے اور ان کے مرثیوں کو وہ حسن عطا کیا ہے جو ایک آرٹسٹ کا منصب ہے کچھ بند ملاحظہ کیجئے۔

اے جستجو فکر نمایاں کمال کر — عرش علوئے عزم و عمل سے مقال کر
خونِ جگر سے صفحہ قرطاس لال کر — لکھ فکر جبریل کا شہپر نکال کر
کاغذ پکار اٹھے کہ خدا کا ولی علیؑ
بولے زبانِ خامہ شہپر علیؑ علیؑ

ہے انقلاب میرے قلم کی صفات میں — یاد عطش کا کلک ہے دست حیات میں
پیاسوں کی پیاس کی ہے سیاہی دوات میں — دیکھیں گے آپ آگ لگا دوں فرات میں
پیاسوں کی یاد آئے گی تدبیر سے مری
نکلے گی آگ گرمی تحریر سے مری

شکلیں وہ کھینچ نقل پہ ہو اصل کا گماں — بجلی چمک کے گر پڑے بنتے ہی آشیاں
مینا سے سن لوں قلقل مینا کی ہچکیاں — ساغر کی شکل بنتے ہی چھا جائیں بدلیاں
اشکال کے خطوں میں ہو تنویر میکدہ
نشہ چڑھے جو دیکھ لوں تصویر میکدہ

لفظوں سے تصویریں باقر صاحب نے جا بجا بنائیں ہیں لیکن باقر صاحب کی مذہبی علوم پر بھی اچھی نظر ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے مرثیوں میں قرآن و حدیث کو اکثر مقامات پر نظم کیا ہے۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ضرورت شعری کے تحت بھی کہیں کوئی آیت کی تفسیر یا حدیث کا متن بدلنے نہ پائے مثلاً فضیلت حضرت علیؑ کی مشہور حدیث کو یوں نظم کیا ہے۔

تصویر کھینچ پہلے تو آدم کے علم کی — کر فہم نوح و علم خلیلی کو منجلی

اور اسپہ کھینچ ہیبت موسیٰ کی شکل بھی اب غور کر کہ کس کی شباہت ہے آ گئی

آئینۂ حدیث نظر آئے گا وہاں

چہرہ علیؑ کا آپ ہی بن جائے گا وہاں

آرٹ اور شاعری کا حسین امتزاج اس بند میں ملاحظہ فرمایئے۔

عاشور کی سحر کا ذرا کھینچ دے سماں جس سے عیاں ہو قسمت حشر کی تجلیاں

سیدھے خطوں پہ مہر کی کرنوں کا ہو گماں پیدا اتری حریر سے ہو اکبری اذاں

یوں مضطرب ہو نور کہ پارہ کہیں جسے

نقطہ وہ دے کہ صبح کا تارا کہیں جسے

تصویریں بنانے کا یہ انداز بھی دیکھیئے۔

سطح کاغذ ہوئی تر کھینچ گئے جب دیدہ نم ہچکیاں آنے لگیں بن گئے ساغر جسدم

کھینچ دی کلکِ مصور نے جو تصویر حرم سجدے کرنے لگا ہر گام پہ بہزاد قلم

نقشِ دریا بنا آواز لب جو آئی

پھول کا بننا تھا قرطاس پہ خوشبو آئی

زلفِ سجادؑ کا سایہ پڑا زنجیر بنی شکلِ اصغرؑ جو کھینچی پیاس کی تصویر بنی

بن گئی اشکِ ندامت رہ تدبیر بنی حُرؑ کی تصویر کا بننا تھا کہ تقدیر بنی

صبحِ عاشور کی تصویر میں تارا چمکا

لوحِ محفوظ پہ قسمت کا ستارا چمکا

مرثیہ اپنی ساری وسعتوں کے باجود بھی بہر حال شہیدان کربلا کی عظمتوں کے اظہار اور ان کے مصائب پر غم والم کو ابھارنے کی نیت سے لکھا جاتا ہے۔ اس لئے مرثیے میں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو اسے مرثیہ کہنا میرے اپنے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ مرثیے کے اس وصف پر سارے قابل ذکر مرثیہ نگاروں نے توجہ دی ہے۔

باقر صاحب نے اپنے مرثیوں میں مرثیے کے ان اہم اجزاء کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اس رخ پر بھی باقر صاحب کے آرٹ نے مرقع کشی کرنے میں ان کی خاصی مدد کی ہے۔

شہزادی زینبؑ کی مدح کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

حیدری وصف و محاسن کا خلاصہ زینبؑ عصمتِ فاطمہ زہراؑ کا سراپا زینبؑ
ساحلِ نہر یہ ایک پیاس کا دریا زینبؑ عرشِ معراجِ جلالت کا ہے پردا زینبؑ
سامنے یوں صفتِ ہم بزلی آتی ہے
اسی پردے سے تو آوازِ علی آتی ہے

حضرت عون ابن علیؑ کی تصویر دیکھئے

اک ضوفشاں گہر ہے صدف جس کا ہے مکاں
اک پھول ہے جو ہنستا ہے پتوں کے درمیان
اک چاند ہے جو ابر کے پیچھے ہے ضوفشاں
اک تیغ ہے نیام لقامیں جو ہے نہاں
وہ قلب جسکا وصف شجاعت پسند ہے
خوشبو یہ وہ جو شیشۂ عظمت میں بند ہے

حضرت علی اصغرؑ کا مرقع یوں بنایا ہے

جس پہ رن میں ہوا قرآں کا گماں وہ اصغر
پیاس سے سانس بنی جس کی دھواں وہ اصغر
جسنے ہنسکر کیا مقصد کو عیاں وہ اصغر
عزمِ نصرت میں جو بچہ تھا جواں وہ اصغر
نامِ اصغرؑ ہے کہ ہے حرزِ جوادِ اکبر

رن میں بے تیغ کے کرتا ہے جہادِ اکبر

شہزادی زینبؑ کے فرزندوں عونؑ و محمدؑ کی تصویریں یوں ہیں۔

نیچے ہاتھوں میں اور پشت پہ چھوٹی ڈھالیں
خوب یہ جانتے ہیں فوج عدو کی چالیں
سر پہ وار آئے تو ہنستے ہوئے اس کو ٹالیں
روحیں کھینچ جائیں اگر آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں

ان کے چہروں سے عیاں سبط پیمبرؐ کا وقار
ان کے تیور سے عیاں صولت جعفرؑ کا وقار

مجلس عزا کا آل گریہ ہے۔ مرثیے مجلسوں میں پڑھنے کے لئے ہی لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے مرثیے میں مصائب کے بند اہمیت رکھتے ہیں۔ مصائب کا بیان ذاکرین نے شعراء سے سیکھا ہے اس لئے شعراء ہی نے قتل کی روایت کو نظم کرتے وقت نفسیات انسانی کا خاص خیال رکھا ہے۔ باقر صاحب نے مصائب کو مقاتل سے لیا ہے اور مصائب کے بیان میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ عظمت اہلبیت پہ حرف آنے نہ پائے۔

شہادت امام حسینؑ کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

گر کے مرکب سے جھکے سجدہ حق میں سرور
دیر تک تیروں پہ قائم رہا جسمِ اطہر
ذکر خالق میں تھے مشغول شہؑ جن و بشر
شمر بدکار بڑھا ہاتھ میں لیکر خنجر

آستیں چڑھتی تھی سفاک کی جن وقفوں میں
حمد حق کرتے تھے شبیرؑ انہی لمحوں میں

حضرت عباسؑ اپنی ایک مصیبت میں منفرد ہیں۔ جب گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے تو ہاتھ نہ تھے کہ ان کا سہارا لیتے۔ باقر صاحب نے اس مصیبت عظیم کی یوں نظم کیا ہے۔

مرکب سے گرا لو اسدؑ اللہ کا پیارا،
سر ہوتے ہی شق بہنے لگا خون کا دھارا

بے دست کو کس طرح سنبھلنے کا ہو یارا
گرتے ہوئے وہ خاک پہ لے کسکا سہارا

مظلوم کا انداز ہی ہر اک سے جدا ہے
اس بیکسی سے کوئی نہ گھوڑے سے گرا ہے

لاش علی اکبرؑ پر امام حسینؑ کے پہنچنے کو باقر صاحب نے باپ کی نفسیات پیش نظر رکھ کر یوں نظم کیا ہے۔

بیٹھے ہیں خاک پہ باحال پریشاں سرور
فرش سے تا بہ فلک ہوگیا آہوں کا اثر

باپ کی آنکھوں سے ڈالی جو نظر سینے پر
اور گہرا نظر آنے لگا زخم اکبر

صاف کی گرد جواں سال کے رخساروں سے
زخم اکبرؑ کو سیا آنسوؤں کے تاروں سے

شہزادی زینبؑ کا کمال صبر اپنے بیٹیوں کی لاشوں کے درمیان سجدہ تھا۔ باقر صاحب نے اسے یوں نظم کیا ہے۔

پہنچی خبر جو موت کی محشر بپا ہوا
شبیر کے قیام میں اک تہلکہ ہوا

الحرم تو کرتے تھے سر کھول کر بکا
زینب ؑ نے لاکے اپنا مصلے بچھا دیا

آنسو کو پی کے صبر کی منزل پہ رک گئیں
اور تھر تھرا کے شکر کے سجدے میں جھک گئیں

باقر امانت خانی ان چند شعراء میں سے ایک ہیں جنھیں ان کی زندگی ہی میں داد فن ملی انکے سارے مرثیے چھپ چکے ہیں۔ ہر سال ایک مرثیہ کتابی شکل میں مجلس میں تبرک کے طور پر تقسیم ہوتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد میں ۵ مرثیے امانت سخن کے نام سے اور کراچی سے ۱۵ مرثیے امانت غم کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مرثیوں پر ادب اور مذہب کی دنیا کی سرکردہ شخصیتوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ جناب نسیم امروہی لکھتے ہیں۔

" باقر صاحب کا حسن اعتدال ہے۔ وہ مرثیے میں نہ تو یکسر قدیم ہیں نہ سراسر روکھی قسم کی جدیدیت کے علمبردار۔ ان کے مرثیے قدیم وجدید فکر کا حسن امتزاج ہیں " (امانت غم صفحہ نمبر ۵۹)

پروفیسر احتشام حسین نے باقر صاحب کے ایک مرثیے پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں لکھا ہے۔

" آج کا مرثیہ نگار کلاسیکی طرز ادا کی طرف واپس نہیں جاسکتا۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ کوشش کرے واپس بھی جائے تو اپنے عہد کے سامعین سے جذباتی اور فکری ہم آہنگی نہیں پیدا کرسکے گا۔ چنانچہ موجودہ عہد کے اکثر مرتبہ نگار اس حقیقت کا احساس رکھتے ہیں اور شعوری طور پر اپنی راہ بدل رہے ہیں۔ انہی میں باقر امانت خانی بھی ہیں۔

(سیمنار۔ دہلی اردو اکیڈمی)

خیرات ندیم - اپنی شاعری کے آئینہ میں

جب کبھی فن فنکار کی پہچان بن جاتا ہے اور اس کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے تو فن کلاسیکی ادب کا حصہ بنتا ہے جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر صدیوں تک زندہ رہتا ہے۔ مجھے اب یہ یاد نہیں ہے کہ میں نے یہ کہاں اور کس کتاب میں پڑھا تھا لیکن چونکہ بات اچھی اور سچی تھی اس لئے ذہن میں محفوظ رہ گئی۔ میں خیرات ندیم سے واقف ہوں۔ ان کی شخصیت پر لکھ سکتا ہوں۔ ان کے فن پر گفتگو کا آغاز بھی کر سکتا ہوں لیکن خیرات ندیم نے خود ہی اپنے اشعار میں اپنے محرک عمل کو واضح کر دیا ہے۔ اس لئے خیرات ندیم کی شاعری کے پس منظر کو انہی کے اشعار سے سمجھنا میرے خیال میں بہتر و مناسب ہے۔ ندیم کے یہ شعر سنئے جو ان کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اپنا اک اسلوب ہے لہجہ ہے جادہ ہے ندیم
اپنی ہر تخلیق ہے تخلیق، لے پالک نہیں

میں ان کو شعر کے سانچوں میں ڈھال لیتا ہوں
بکھر نہ جائیں کہیں زندگی کے افسانے

جل اٹھیں ندیم آخر مشعلیں حقائق کی
شاعری مسائل سے بے خبر نہیں ہوتی

میرا اسلوب میرے دور کا لہجہ ہے ندیم
میرے فن نے دل دوراں میں جگہ پائی ہے

ریت بن جاتا ہے ان اونچے پہاڑوں کا وجود
باندھ کر چلتے ہیں جب کوئی ارادہ ہم لوگ

کچھ تو ہو انعام فن آخر ندیم
طنز کے نشتر ہوں آوازہ تو ہو
برتا ہوں سوچ سوچ کے الفاظ کا مزاج
حُسن تمام شعر کے سانچے میں ڈھل گیا
ہم اپنے عہد کی تصویر ہیں کبھی سوچو
ہم ایسے لوگ ہی اہل نظر میں ہوتے ہیں
کس نے کہا کہ بھولا ہوا سا فسانہ ہیں۔
ہم کل بھی ایک عہد تھے اب بھی زمانہ ہیں
دلوں کا درد جب اوراق پر ابھر آئے
وہی فسون قلم ہے وہی نگارش ہے

نمونتاً میرے منتخب کئے ہوئے ان اشعار سے خیرات ندیم کی فکر و جذبات کا جو راستہ بنتا ہے وہ شاعری میں (objectivity) سے عبارت ہے۔ ندیم کے پاس شاعری تفریح کا ذریعہ ہے نہ تقلید کا جادہ۔ وہ وہی کہتا اور لکھتا ہے جو سوچتا اور محسوس کرتا ہے یہ الگ موضوع ہے کہ شاعر کے لیے idealogy اور objectivity ضروری ہے یا نہیں، لیکن آپ اس کی ضرورت کو نہ بھی مانتے ہوں تو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ ان عناصر کے وجود سے شاعر کی شاعری ایک پیغام بن جاتی ہے۔ اگر شعر مثبت قدروں کی تبلیغ کا ذریعہ ہے تو پھر شاعر کو اپنے دور کی تاریکیوں کی نہ صرف نشاندہی کرنی چاہیئے بلکہ اسکو ان سے برزد آزما بھی ہونا چاہیئے۔۔ صاحبان فکر کی طرح شاعر پر بھی اس کے اپنے دور کے سیاسی، سماجی اقتصادی حالات اور تحریکوں کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ان تینوں اضلاع سے ملکر جو مثلث بنتا ہے اسی کے کسی نقطہ کو مرکز بنا کر شاعر اپنی فکر کی عمودی پرواز کا آغاز کرتا ہے جو اسے زمانے کے حدود سے آزاد کرنے کا باعث بنتی ہے۔ شاعری کی حدیں یہیں پہنچکر تاریخ سے ملتی ہیں لیکن ایک مورخ اور شاعر کے

درمیان جو بنیادی فرق ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مورخ کو صرف واقعے کے حقائق سے سروکار ہوتا ہے لیکن شاعر اس واقعہ سے افراد پر ہونے والے اثرات کو اشعار کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ آج جب تاریخ کے مطالعہ کا رنگ ڈھنگ تیزی سے بدل رہا ہے اور مورخ سیاسی تاریخ سے ہٹ کر سماجی اور اقتصادی تاریخ پر توجہ دے رہے ہیں۔ ان شعراء کا کلام بڑا معاون ہو رہا ہے جنھیں اپنے دور کا سیاسی، سماجی اور اقتصادی شعور رہا ہے۔ ندیم کو اس کا احساس بڑی شدت سے ہے کہ وہ آج کی تاریخ کے مصنف ہیں۔ ان کی شاعری میں تاریخ کے موضوع پر کئی شعر ہیں۔

ہم ایک عہد ہیں تاریخ ہیں زمانہ ہیں
ہمیں بھی یاد کروگے کسی سبق کی طرح

نئی حیات کی تاریخ ہم بنا کے چلے
ہم اپنے عہد کا آئین آزما کے چلے

جب کسی تاریخ کے سینے پہ خنجر چل گیا
ہر حقیقت چھپ گئی لوگوں تک افسانے گئے

نئی تاریخ مرتب کرو میخانے سے
بجلیاں بھر کے پلادو مجھے پیمانے سے

تاریخ بن گئے تھے جو اوراق زیست پر
صدیاں سمیٹ کر وہی لمحے گذر گئے

ہم سے تاریخ مرتب ہے مثالوں کی طرح
عہد کا قرض ہے کیا ہم پہ یہ دیکھیں گے

یہ جو تاریخ کے ماتھے پہ شکن آئی ہے
میری رسوائی نہیں عہد کی رسوائی ہے

تاریخ کا یہ شعور کسی بھی شاعر یا ادیب کے لئے نعمت ہے۔ وقت کے بدلتے ہوئے

دھارے اور دھرتی پر ہونے والے حادثات کا عرفان شاعر کو اسی وصف کے طفیل نصیب ہوتا ہے ۔خیرات ندیم اس باب میں خوش قسمت ہیں کہ ان کی شاعری ہمیشہ ہی مسائل سے وابستہ رہی ہے۔

ندیم کی شاعری کی ابتداء اس دور میں ہوئی جب دنیا دوسری عالمی جنگ کی تباہیوں میں گھری تھی ۔جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے انسانی وجود کے لئے خطرہ بنے ہوئے تھے اور ان تباہیوں کے ساتھ یوں بھی تھا کہ دوسری عالمی جنگ دو مختلف قسم کی idealogies کا ٹکراؤ تھی ۔ندیم کا ذہن ان فضاؤں میں بیدار ہوا تو ایک سچے فنکار کی طرح ندیم نے جنگ کی تباہ کاریوں اور اس کی ضرورت پر دل کھول کر لکھا تھا۔ندیم کے تیسرے مجموعہ "اوراق گل میں" یہ نظمیں شامل نہیں ہیں لیکن اپنی بات کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کے لئے میں ان کے دوسرے شعری مجموعے "موباف سحر" کی دو نظموں "نیلے پرچم" اور امن کی چھاؤں سے صرف دو بند پیش کروں گا۔

خون کے سوداگروں سے زندگانی چھین کر
ہم رخ ہستی کو دیں گے غازہ نورِ سحر
اٹھی شکتی کا چپ چپ چیر کر قلب و جگر
اک نئی دنیا بسائیں گے بہ انداز دگر
مسکرا کر دور پر

امن کی چھاؤں کا یہ بند بھی ملاحظہ کیجئے

جنگ بازوں کو فنا کا جام دینے کے لئے
زندگی کو زندگی کا نام دینے کے لئے
وقت کا سب سے بڑا انعام دینے کے لئے
عصر نو کو امن کا پیغام دینے کے لئے

مسکراتی صبح رنگیں شام دینے کے لئے

عالمی جنگ کے شعلے بجھے تو ہندوستان کی تحریک آزادی پر شباب آیا Imperalism کے خلاف شعراء اور ادیبوں نے قلم سے جہاد کیا۔ ندیم بھی اس میں شامل ہوئے لیکن ندیم کی شاعری کا وصف اسکا Optimism ہے۔ وہ اندھیروں کی بات نہیں کرتا بلکہ اندھیروں کی گرفت سے روشن سحر کو نمودار کرنے کا عزم دیتا ہے۔ اس نے ہندوستان کے غریب ٹھکرائے ہوئے بے بس انسانوں کے غم کی تصویر کشی نہیں کی بلکہ انکو پیام جدوجہد دیا ہے۔

ساتھ لائیں گے بہاروں کو بیابانوں سے
آج افسانہ دستور چمن اور سہی
خزاں کی گود میں پلتی ہوئی راتوں کے ہنٹوں پر
بہار صبح مستقبل کے افسانے بھی آئیں گے
بنالے رازداں موجوں کو اپنا بحر ہستی میں
یہاں طوفان سے کیا ڈرنا یہاں طوفان تو ہوتے ہیں

لیکن وہ سحر جس کی امیدیں لیکر صاحبان قلم نے طوفانون کا مقابلہ کیا جب ہندوستان کے افق پر نمودار ہوئی تو بینا آنکھوں نے یہ دیکھا کہ اس کے دامن میں تاریک راتوں جیسا اندھیرا ہے۔ دوسروں کی طرح ندیم نے بھی اسے تسلیم کیا لیکن یہاں بھی ندیم کا انداز نہیں بدلا وہ ان اندھیروں کے خلاف بھی اعلان جنگ کرتا ہوا لگتا ہے

اگر یہ جبر مسلسل ہی قدر عالی ہے
تو آج ہمنے بھی رسم وفا اٹھالی ہے
اب اس سحر کو ہے اک اور بھی سحر کی تلاش
وہ اک سحر جو بہاروں سے آنے والی ہے
دور حاضر بھی ہے پابستہ و محزوں کتنا

فرق یہ ہے کہ روایات ستم بدلے ہیں

وہی عالم ہے وہی تلخی دوراں ہے ابھی

کون کہتا ہے کہ انسان کے غم بدلے ہیں

ہر زخم پکار اٹھتا ہے دنیا ہے صدا گھاو

بڑھتا ہی چلا جاتا ہے حالات کا پتھراؤ

لائے تھے جسے رات کے مقتل سے بچا کر

اس صبح کو اس صبح کی پھانسی پہ چڑھاؤ

امن کا روپ دیا جاتا ہے بدامنی کو

بیقراری کا یہاں نام شکیبائی ہے

وقت کے ساتھ بدل جائیں یہ ناممکن ہے

وقت کو ہم نے بدلنے کی قسم کھائی ہے

اک نئی صبح کی تخلیق یقیناً ہو گی

عہد کا کرب ہی جب فرد کی خواہش ہو گی

ندیم کا قلم سے یہ مسلسل جہد اب بھی جاری ہے۔ کہیں بھی کسی بھی وقت کسی زمین پر اگر انسانیت پر ظلم ہو تو ندیم کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ وہ غزل کے اشعار میں اپنے اس دور کا اظہار بھی کرتا ہے اور اپنے عزم و ارادے کا اعادہ بھی۔ حیدرآباد کی امن پسند بستی میں جب حیدرآبادیوں کی آنکھوں کے سامنے ان کی تہذیب کے سینے میں خنجر گھونپ دیا گیا تو ندیم کے سینے سے لہو برسا جسے اسنے اپنی غزل کے شعروں میں بھر دیا۔

یہ واردات مسلسل ہے کیا کیا جائے

نظر کے سامنے قاتل ہے کیا کیا جائے

ہر ایک سمت سے جیسے بھڑک رہی ہو آگ

سروں پہ خون کا بادل ہے کیا کیا جائے

ملیں گے آپ کو سو خون میں غوطہ زن چہرے

ہر ایک ماتھے پہ اک بل ہے کیا کیا جائے

ردائیں چھن گئیں دوشیزگی کھلے سر ہے

کہیں پھٹا ہوا آنچل ہے کیا کیا جائے

ندیم پھر کوئی افواہ چل پڑی شائد

سکون شہر میں ہلچل ہے کیا کیا جائے

اس غزل کے علاوہ بھی کئی ایک شعر اس پس منظر میں ہیں

لکھی ہے پھر سے فسادات کی نئی تاریخ

ہمارے دور کے یارانِ انتظامی نے

سر چھپانے کے لئے اک گھر تھا وہ بھی ڈھیر ہے

آنے جانے کے لئے لوگوں کو رستہ ہو گیا

بدل چکا ہے بہت شہرِ دلبراں کا مزاج

عجیب زہر ہے اب وہوا کے لہجے میں

ندیم کی سیاسی سوجھ بوجھ اور اس کی سماجی بصیرت کا میں نے یہ سرسری جائزہ آپ کی خدمت میں پیش کیا لیکن اس کے ساتھ مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ ندیم کی شاعری ایک ہی رخ پر بہتا ہوا دریا نہیں ہے۔ ان مسائلی اشعار کے ساتھ ساتھ ندیم کی غزلوں میں وہ سب نزاکتیں اور اجزا موجود ہیں جو غزل کو غزل بناتے ہیں۔ کہیں کہیں خالص غزل کے شعر بھی مل جاتے ہیں ندیم کے تیسرے مجموعے میں ان کی تعداد نسبتاً کم ہے لیکن جو بھی اشعار ہیں خاصے ہیں جن میں ندیم کا اپنا مزاج موجود ہے۔

کن نگاہوں نے میری زیست میں ڈالی ہلچل

وہ اڑا کاگ گھٹاؤں میں وہ ٹوٹی بوتل
مستی بھری گھٹاؤں میں پینے کی آرزو
میں کب سے منتظر ہوں یہ ساماں لئے ہوئے
یہ شام میکدہ یہ بہاریں یہ مستیاں
آجاؤ نا شبابِ غزل خواں لئے ہوئے
اپنا بھی کیا شباب تھا اب کیا کہیں ندیم
آہٹ سنی تو چاند دریچے میں آگیا
دیکھوں تو ہوئی جاتی ہیں خیرہ میری نظریں
شائد کوئی اوڑھے ہوئے سورج کی ردا ہے
تیری زلفوں میں پنہاں سرد ساون کی گھٹائیں ہیں
تیری آنکھوں میں رنگیں میکدہ آباد ہے ساقی
روبرو آج مجسم ہے قیامت جیسے۔
ذوق تازہ کوئی انگڑائی اٹھالایا ہے
تیرے حسین تبسم کی بجلیاں دل میں
بنام درد بسانا کوئی مذاق نہیں
اظہارِ محبت کی بھی یہ خوب ادا ہے
دستی کے کنارے پہ میرا نام لکھا ہے

ندیم نے برسوں فن کو اپنا لہو دیا ہے لیکن ہمارے دور کا یہ المیہ ہے کہ فنکار کو ہم اس کے فن کا صلہ اس کی ناقدری کی صورت میں دیتے ہیں ۔ ندیم کے پچھلے دو مجموعوں کے بہ نسبت اس مجموعے میں کئی ایسے شعر ہیں جس میں ندیم کا ٹوٹا ہوا دل صدا دیتا ہے ۔ اسے دانشوروں سے بھی شکایت ہے اور شعرا سے بھی ۔ اس نے کھل کر اپنے جذبات کو لفظ دیئے

ہیں ۔یہ شعر کسی احساسِ کمتری کے شکار مریض ذہن کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے شاعر کے بیدار ذہن کی عطا ہیں جسے مسائل کا ادراک ہے ۔اس لئے ان اشعار کو صاحبانِ فکر و نظر کے لئے ایک عنوان بننا چاہیے ۔ شعرا اور ادیبوں کی خانوں میں تقسیم، ناشعروں کا عروج، دانشوروں کی بے راہ روی، تنقید کے نام پر نفرتوں کا پرچار ایسے مسائل ہیں جو آج کی ادبی دنیا کو گندا کر رہے ہیں ۔ندیم نے ان کی نشاندہی کی ہے

عجیب حال تھا دانشوروں کے جسموں پر
تمام لفظ تھے مفہوم کا لباس نہ تھا

ہے آج خلعتِ شعر و ادب بھی جہل کے ہاتھ
ہمارا دورِ سخن بھی عجب مثالی ہے

آج بونے میرا قد ناپ رہے ہیں یارو
سازشِ ذہن سے اور جہل کے پیمانے سے

قتل سے صلیبوں سے رہا واسطہ جن کا
اربابِ وطن ہی انہیں اب بھول گئے ہیں

کسی بھی عہد کی تاریخ میں نہیں ہے ندیم
بنام شعر و ادب آج جتنی سازش ہے

ندیم کی شاعری میں کچھ اور بھی حسن ہیں جن پر لکھا جانا چاہئے لیکن میں بس اتنا لکھ کر اس مضمون کو تمام کرتا ہوں کہ خیرات ندیم حیدرآباد کے افق ادب کے اس ستارے کا نام ہے جس کی روشنی نے ادب کی راہوں میں اجالا بکھیرا ہے اور یہ روشنی تب تک باقی رہے گی جب تک انسانوں کی آنکھوں میں بینائی موجود رہیگی ۔

(شب خیرات ندیم ۔کریم نگر)